رام کٹیا بک ڈپو سیریز نمبر ۲ — جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ

اوم

تہذیب کے تازیانے

بنگال کے مشہور پولٹیکل ناول نویس بابو بنکم چندر چٹرجی
کے دل میں اُتر جانے والے اثر ریز، قومی اور مُلکی جذبات
میں ڈوبے ہوئے مضامین کا مجموعہ

مُترجمہ فطرت نگار سُدرشن صاحب

جسے
مینیجر رام کٹیا بک ڈپو لاہور
نے

مرکنٹایل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوان چند پروپرائٹر چھپوایا
سنہ ۱۹۲۳
دوسری بار ۱۰۰۰ جلد — قیمت فی جلد ۱۲ ار

فہرست مضامین

دیباچہ

بنکم بابو کا شمار ان محبِ الوطنوں میں کیا جاتا ہے۔ جو اپنی قوم کو بیدار کر دیتے ہیں اور مرتے ہوئے ملک پر زندگی کا پانی چھڑک دیتے ہیں بنگال میں آج جو بیداری ہے اس کا سرچشمہ بنکم بابو کی کتابیں ہیں۔ بلاشبہ ان سے پیشتر بنگالی زبان نہایت کم بضاعت و بے مایہ تھی اور بنگالیوں کا اس کی طرف چنداں دھیان نہ تھا۔ لیکن بنکم بابو کی کتابوں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور ان پر واضح کر دیا۔ کہ لطیف سے لطیف خیالات اور سنجیدہ سے سنجیدہ امور کو بنگالی میں بحسن و خوبی ادا کیا جا سکتا ہے مشہور بنگالی مصنف آر سی دت اس وقت انگریزی میں لکھا کرتے تھے۔ بنکم بابو نے ان سے کہا آپ بنگالی میں کیوں نہیں لکھتے۔ دت بابو نے جواب دیا۔ بنگالی میں تو لکھنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ بنکم بابو بولے نہیں آپ جو کچھ لکھینگے۔ وہی طریقہ بن جائیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسٹر آر سی دت نے بنگالی میں لکھنا شروع کر دیا اور ان کے ناول آج لٹریچر کی جان ہیں ؎

بنکم بابو چوبیس پرگنہ ضلع کے کانٹال پاڑا نامی گاؤں میں ۲۶۔ جون ۱۸۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد یادو چندر چٹرجی ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز تھے پانچ سال کی عمر میں آپکی تعلیم شروع ہوئی۔ اسی وقت معلوم ہو گیا۔ کہ یہ بچہ کسی دن اپنا نام پیدا کریگا وہ سارا دن کھیلتا رہتا تھا۔ سکول کی کتابوں پر سرسری نظر اٹھا کر دیکھتا تک نہ تھا۔ یہاں تک کہ گھر آ کر وہ جزدان کھول تک نہیں تھا۔ لیکن امتحان کے دن قریب آتے۔ تو کھیلنا کودنا سب فراموش ہو جاتا۔ کھلاڑی لڑکا جماعت میں اول رہ جاتا۔ مگر کالج میں جا کر وہ کتاب کے کیڑے بن گئے۔ لائبریری کی جو جو کتاب پسند آئی۔ پڑھ ڈالی۔ اور ۱۸۵۸ء میں بی اے کے امتحان میں اول رہے۔ اسوقت ان کی عمر

محض بیس سال کی تھی لیکن لیاقت پر لوگ عش عش کرتے تھے لفٹننٹ گورنر مسٹر ہالڈے نے سنا۔ تو ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ یہ اعزاز اس زمانہ میں بڑا نظر فریب تھا۔
بنکم بابو کا اپنا بیان ہے کہ میرا جی نہ چاہتا تھا۔ کہ ملازمت کے جنجال میں پھنسوں لیکن تنخواہ کی کشش کام کر گئی۔ تاہم مضمون نویسی کا شغل برابر جاری رہا۔ ان دنوں بنگالی میں سنواد پربھاکر" اور "سادھو رنجن" نام کے دو رسالے شائع ہوتے تھے۔ بنکم بابو ان میں اکثر لکھا کرتے تھے ان مضامین کی عمدگی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ لوگ ان کیلئے بیتاب رہا کرتے تھے۔ بنکم بابو کو سرکاری کاموں سے فرصت ہوتی۔ تو ناول لکھنے لگتے اس تھکے ہوئے دماغ کا نتیجہ "درگیش نندنی" ہے جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا۔ بنکم بابو کا یہ سب سے پہلا ناول تھا جس نے بنگالیوں میں خودداری کا احساس بیدار کیا۔ اسوقت تک انہیں خیال ہی تھا کہ اس زبان میں کوئی عمدہ ناول لکھا بھی جا سکتا ہے۔ بنکم بابو نے ان کے سامنے ایک نیا رستہ کھولدیا۔
۱۸۷۲ء میں آپ نے پنشن لیکر "بنگ درشن" نامی رسالہ جاری کیا۔ جس نے بنگال کی حالت تبدیل کر دی۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریزی تہذیب ہندوستان پر عموماً اور بنگال پر خصوصاً پورے زور سے حملہ آور ہو رہی تھی گاؤں گاؤں میں انگریزی سکول کھل رہے تھے اور لوگ اس طرف اسطرح جا رہے تھے۔ جیسے پیاسا ہرن پانی کی طرف۔ بنکم بابو کا دل اس بات پر روتا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ ہم چند روپوں کی خاطر اپنی جنس نایاب کو لٹا دیں بنگ درشن میں انہوں نے اس نئی تہذیب کے پرخچے اڑا کر رکھدیئے اور بلاشبہ اگر بنگال اس تہذیب کے دلفریب مگر تباہ کن اثرات سے آج کسی حد تک بچا ہوا ہے تو وہ بنکم بابو کی تحریروں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یہ سیلاب اس قدر پر زور تھا۔ کہ بنگال کو باآسانی بہا کرلے جا سکتا تھا۔
بنکم بابو کی تصانیف میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ نے ان میں مذاق کی ایسی پاکیزہ چاشنی دی ہے کہ دل لٹو ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے متعلق ان کے خیالات نہایت بلند تھے۔ اور اپنے ناولوں میں انہوں نے ان کی تصاویر نہایت متبرک بلند بینٹ کی ہیں

آپ بالکل پُرانے خیال کے آدمی تھے۔ آپکا دل پرانی تہذیب پر مٹا ہُوا تھا اور حب الوطنی تو آپکی گھُٹی میں پڑی تھی سرکاری ملازم ہوتے ہوئے رائے بہادر اور سی۔ آئی۔ ای کا خطاب رکھتے ہوئے آپ وہ کچھ لکھ گئے ہیں۔ جو آج آزاد لوگ لکھتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں حیرت ہے کہ گورنمنٹ نے اُن کی تحریروں کو کس طرح برداشت کیا؟

بنکم بابو کی یُوں تو ایک ایک کتاب لاجواب بے مدیل ہے۔ لیکن اگر حادثات زمانہ کے بے رحم ہاتھ اُن سب کو مٹا دیں اور صرف "بندے ماترم" کا گیت بچ جائے۔ تو وہی آپکے نام کو امر اور اٹل رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس گیت میں بنکم بابو نے بھارت ماتا کی شان و شکوہ کا کیسے پُر درد الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں آج کونسا سیاسی جلسہ ہے جس میں یہ گیت نہ گایا جاتا ہو۔ ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہُوا ہے۔ لوگوں پر جذبے کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ جو قومیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ ہندوستان کا یہ قومی گیت لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے اور جیسی مقبولیت اسے حاصل ہوئی ہے۔ دور حاضرہ کی کسی نظم کسی کتاب کسی مضمون کو نصیب نہیں ہوئی؟

سُوجلام۔ سُوپھلام۔ ملیج شیتلام شسیہ شیاملام
بندے ماترم

شبھر جیوتسنا پُلکت یامنیم پھل کُسمت درم دل شوبھینم
سوہاسینم۔ سُومدھر بھاشنیم۔ سکھدام۔ وردام۔ ماترم
بندے ماترم

ترنش کوٹی کنٹھ کل کل نناد کرالے
دو ترنش کوٹی بھجے دھرت کھر کرالے
کے بولے ماں! —— تومی ابلے
بھوبل دھارنیم۔ نمامی تارنیم۔ ریپو دل وارنیم ماترم

بندے ماترم
تومی ودیا - تومی دھرم - تومی ہردیہ - تومی مرم
تومی پران شریرے
باہوتے تومی ماں شکتی ہردے تومی ماں بھگتی
تماد پرتما گڑی مندرے مندرے
تومی درگا دش پرہرن دھارنی - کملا کمل دل دھارنی
بانی ودیا دائیں نمامی توام
نمامی کملام - املام - رتلام - سوجلام - سوپھلام - ماترم
بندے ماترم
شیاملام - سرلام - سوسمتام - بھوشتام - دھرنیم - بھرنیم - ماترم
بندے ماترم

ترجمہ

اعلیٰ جلوں والی اعلیٰ پھلوں والی چندن سے ٹھنڈے سرسبز کھیتوں والی ماتا کو نمسکار ہو۔
گوری چاندنی والی نکھری ہوئی راتوں والی - کھلے ہوئے پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی قطاروں والی حسین مسکراہٹ والی میٹھا بولنے والی سکھ دینے والی برکتیں برسانے والی ماتا کو نمسکار ہو۔
تیس کروڑ گلوں سے پُر رعب آواز نکالنے والی ساٹھ کروڑ ہاتھوں میں تلواریں پکڑنے والی! تمہیں کون بے بس کہتا ہے؟
انتہا درجہ کی طاقت والی - ڈوبتوں کو بچانے والی بنا دینے والی - دشمن کی صفوں کے منہ پھیر دینے والی ماتا کو نمسکار ہو۔
اے ماتا تو ہی ہمارا علم ہے - تو ہی ہمارا دھرم ہے - تو ہی ہمارا دل ہے تو ہی دل کا راز ہے

تو ہی ہمارے جسم کی جان ہے ٭
اے ماں! بازوؤں میں تیری طاقت ہے۔ دل میں تیری عقیدت ہے۔ ہر ایک مندر میں تیری مورتی ہے
تو ہی دس ہتھیار پہننے والی درگا ہے۔ تو ہی کنول کے پھولوں والی کملا ہے ٭
زبان دینے والی کو نمسکار ہو۔
کنولوں میں بسنے والی لکشمی۔ پاک صاف رہنے والی
اپنی نظیر نہ رکھنے والی ماتا کو نمسکار ہو
اعلیٰ پانیوں والی اعلیٰ پھلوں والی ماتا کو نمسکار ہو
ہری بھری جوانی والی محبت سے پر دل والی مسکراہٹ والی۔ سج دھج والی کھلانے
پلانے والی ماتا کو نمسکار ہو۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی ایسا خوبصورت۔ ایسا اثر ریز ایسا جامع اور ایسا رقت خیز قومی گیت موجود ہے۔ جو دلوں میں ہلچل مچا دیتا ہے اور حب الوطنی کی تصویر سامنے کھڑی کر دیتا ہے درحقیقت بنکم بابو کا درجہ لٹریچر اور حب الوطنی میں آفتاب درخشاں کے مانند ہے جس کے نیچے تاریکی اداسی اور سردی ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں ٹھہر سکتی میں نے اس گیت کو کورس کے طور پر گاتے دیکھا ہے۔ لوگ سنتے ہیں اور گرم گرم آنسو ان کے گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔ اور یہ حالت ایک آدھ آدمی کی نہیں ہوتی۔ تمام مجمع رونے لگتا ہے۔ بلا شبہ بنگال میں قومی روح پھونکنے میں جس قدر حصہ اس ایک گیت کا ہے اس قدر کسی اور کتاب کا نہیں ٭

لیکن بنکم بابو کی سحر آرائیوں کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ انہوں نے ایک اور طرز بھی اختیار کیا۔ طنزیہ اس میں انہوں نے انگریزی۔ فیشن اور تہذیب پر پرزور حملے کئے ہیں لیکن نہایت ہی مذاقیہ طور پر یہ کتاب اس کا ایک نمونہ ہے اس میں ان کی متعدد کتب سے مضامین اخذ کئے گئے ہیں۔ جو قومیت کی روح پھونکنے میں بے نظیر ہیں۔

بابو۔ انگریز ستوتر قانون شادی سے صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ ہمارا ملک اس وقت کدھر جارہا ہے طرز تحریر مذاقیہ ہے پڑھ کر قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن نتائج ایسے پُردرد اور ٹھوس ہیں۔ کہ رگوں کا خون منجمد ہوجاتا ہے۔ رامائن اور سپیشل کی چٹھی میں بنکم بابو نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ یوروپین علما کیسی عجیب تحقیقات کرتے ہیں اور کس طرح سراسر ناآشنا ہوتے ہوئے بھی قوم کی قوم اور ملک کے ملک پر اعتراض کرنا شروع کردیتے ہیں غرضیکہ کہاں تک کہا جائے۔ اس کتاب کا ایک ایک مضمون قومیت کی جان اور بیداری کی رُوح ہے۔ ناظرین بڑے غور وفکر سے مطالعہ کریں ایسے عجیب نکتے نظر آئیں گے کہ دماغ چکرا جائیگا۔ اُردو میں اپنی قسم کی یہ پہلی کتاب ہے ؞

بنکم بابو نے جو ناول لکھے ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) درگیش نندنی (۲) وش برکش (۳) چندر شیکھر (۴) کرشن کانت کی وِل (۵) جنی (۶) راج سنگھ (۷) سیتارام (۸) آنند مٹھ (۹) دیوی چودھرانی (۱۰) اندرا (۱۱) رادھارانی (۱۲) کپال کنڈلا وغیرہ ؞

اس کے علاوہ کملاکانیز دفتر۔ لوک رہسیہ اور کرشن چرت نامی کتابیں بھی ہیں جن کا شہرہ بنگال کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک ہے۔ علاوہ ازیں آپکے مختلف مضامین کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں ؞

۱۸۹۴ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ تمام ہندوستان نے ماتم کیا اور خاصکر بنگال میں تو مہینوں آہ وبکا کی آوازیں بلند ہوتی رہیں ؞

رام گلی لاہور
۲۸۔ دسمبر ۱۹۲۱ء

سُدرشن

انگریز ستوتر

۱۔ ہے انگریز! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۲۔ آپ کئی قسم کی خوبیوں سے مملو۔ خوبصورت اور دولتمند ہیں اس لئے ہے انگریز میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۳۔ آپ دشمنوں کی صف کے ہرتار تباہ کرنے والے ہیں۔ آپ قانون وغیرہ کے کرتا (مصنف) ہیں۔ آپ ملازمت کے ودھاتا (مالک) ہیں۔ اس لئے پربھو میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۴۔ آپ جنگ میں بجلی کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں شکار میں نیزہ سنبھالتے ہیں عدالت میں آدھ انچ موٹا بیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہے انگریز! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۵۔ آپ ایک طرف دار الخلافہ میں بیٹھ کر حکومت کرتے ہیں۔ دوسری طرف بازار میں بیوپار کرتے ہیں۔ تیسری طرف جا کے کاشتکاری کرتے ہیں۔ اس لئے ہے وراٹ سوروپ! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۶۔ آپ کا ستوگن آپ کی کتابوں سے آپ کا رجوگن آپ کی جنگ سے آپ کا تموگن آپ کے مؤلفہ مضامین سے ظاہر ہے۔ اس لئے ہے تینوں گنوں میں باکمال! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۷۔ آپ کی ہستی ہے۔ اس لئے آپ ست ہیں۔ آپ دشمن کو جیت کرتے ہیں اسلئے چیتن ہیں آپ امیدواروں کو آنند دیتے ہیں اسلئے ست چت آنند ہیں ہے آپکو پرنام کرتا ہوں۔

۸۔ برمہا۔ پرجاپتی اور وشنو آپ ہی ہیں۔ کیونکہ کملا آپ پر مہربان ہے۔ آپ مہیشور ہیں۔ کیونکہ آپ کی بیوی گوری ہے۔ اس لئے ہے انگریز میں آپکو پرنام کرتا ہوں۔

۹۔ آپ سورج ہیں۔ توپ آپ کا بجر ہے۔ آپ چندر ہیں۔ انکم ٹیکس آپ کا داغ ہے۔ آپ ہوا ہیں۔ ریل آپ کی رفتار ہے۔ آپ پانی ہیں سمندر آپ کی مملکت ہے۔ اس لئے ہے سب دیوتاؤں کے دیوتا! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۱۰۔ آپ سورج ہیں کیونکہ آپ کی روشنی سے ہماری جہالت کی تاریکی دور ہو رہی ہے۔ آپ اگنی ہیں۔ کیونکہ آپ سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ آپ رودر ہیں کیونکہ آپ کا عملہ آپ سے مخوف ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہے مہاراج! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

۱۱۔ ہم رگ۔ یجر۔ سام۔ اتھرو ویدوں کو نہیں مانتے۔ ہمارے وید آپ ہیں۔

ہم منوسمرتی وغیرہ کو بھول چکے ہیں۔ ہماری سمرتی آپ ہیں۔ نیائے میمانسا آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارے درشن آپ ہیں۔ اس لئے ہے بھگوان! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۲۔ مہاراج! آپ کا سفید رنگ۔ صاف ہاتھی دانت کی مانند۔ گورا بغیر ڈاڑھی کے چہرہ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے۔ کہ آپ کی اُستتی (عبادت) کروں۔ اس لئے ہے دیو! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۳۔ آپ بلاشبہ کلجگ میں کرشن کے اوتار ہیں۔ ہیٹ آپ کا مکٹ ہے۔ پتلون پیتامبر ہے۔ اور چابک منوہر مُرلی ہے۔ اس لئے ہے۔ کرشن کنھیا! میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۴۔ ہے ور دینے والے! مجھے ور دیجئے۔ میں سر پر لمبا شملہ رکھ کر آپ کے آگے پیچھے پھرتا رہوں گا۔ آپ مجھ پر مہربانی کیجئے۔ مجھے ملازمت کا چرنا مرت دیجئے۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۵۔ ہے کلیان کاری! میرا کلیان کیجئے۔ میں آپ کی خوشامد کرونگا۔ آپ سے میٹھی میٹھی باتیں کرونگا۔ آپ کی مرضی کے مطابق عمل پیرا ہونگا۔ مجھے بڑا آدمی بنادیجئے۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۶۔ ہے عزت کے دینے والے! مجھے خطاب دیجئے۔ خلعت دیجئے۔ یہ آپ کے مندر کا پرساد ہے۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۷۔ ہے بھگت وتسل! میں آپ کا جوٹھا کھانے کو تیار ہوں۔ آپ کا چرن پکڑ کر سنسار ساگر (بحرِ دنیا) سے پار اُترنے کا خواہشمند ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دو چٹھیاں اپنے بکس میں رکھنے کے لئے میرا دل بیتاب ہو رہا ہے۔ آپ مجھ پر مہربان ہوں۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں ۔

۱۸۔ ہے انتریامی! مَیں جو کچھ کرتا ہوں۔ آپ کو خوش کرنے کے لئے کرتا ہوں آپ مجھے سخی کہیں۔ اس لئے مَیں چندہ دیتا ہوں۔ آپ مجھے نیک سمجھیں اس لئے خدمتِ عامہ کے میدان میں کام کرتا ہوں۔ آپ مجھے لائق جانیں۔ اس لئے لکھتا پڑھتا ہوں۔ ہے دین دیال! مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۱۹۔ مَیں آپ کی اُنگلی کے اشارے پر شفاخانے بناؤنگا۔ سکول کھولونگا۔ چندہ دُونگا۔ آپ میری طرف مُسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھیں۔ مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۲۰۔ ہے بھگوان! آپ جو کچھ کہیں گے۔ مَیں وہی کرونگا۔ کوٹ پتلون اور بوٹ پہنونگا۔ ناک پر چشمہ لگاؤں گا۔ میز پر بیٹھ کر چھُری کانٹے سے کھانا کھاؤنگا۔ آپ مجھ پر خوش ہوں۔ مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۲۱۔ اے شیریں دہن! مَیں اپنی زبان چھوڑ کر آپ کی زبان بولوں گا۔ باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر آپ کا مذہب اختیار کرونگا۔ اپنے نام کے ساتھ مسٹر لکھوں گا۔ آپ مجھ پر مہربانی کریں۔ مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۲۲۔ ہے عمدہ روٹی کھانے والے! مَیں نے دال روٹی کھانا ترک کر دیا ہے۔ اب میں ڈبل روٹی کھایا کرتا ہوں۔ گوشت سے مجھے پرہیز نہیں۔ اس لئے مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۲۳۔ مَیں بیواؤں کا بیاہ کروں گا۔ اونچے خاندان والوں کو مخلوط کروں گا۔ آپ مجھ پر نگاہِ کرم کریں۔ مَیں آپ کو پرنام کرتا ہوں ٭

۲۴۔ سب کچھ دینے والے! مجھے دولت دیجئے۔ عزت دیجئے۔ شہرت دیجئے دین دیال! میری سب آرزوئیں پوری کیجئے۔ مجھے رائے بہادر بنائیے۔

کونسل کا ممبر نامزد کیجئے۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں *

۲۵- مہاراج! میں اگر اس کے قابل نہ سمجھا جاؤں۔ تو مجھے ڈنر میں مدعو کیجئے خاص خاص کمیٹیوں کا رکن بنائیے۔ سینیٹ کا ممبر بنائیے۔ آنریری مجسٹریٹ بنائیے۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں *

۲۶- آپ میری تقریر سنیں۔ میرا مضمون پڑھیں۔ اور مجھے آفرین و مرحبا کہیں اس سے تمام ہندوؤں کی مخالفت کو ذرا بھر بھی وقعت نہ دونگا۔ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں *

۲۷- ہے بھگوان! میں مفلس ہوں۔ آپ کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ آپ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ آپ میرا دھیان رکھئے گا۔ میں آپ کو ڈالی بھیجوں گا۔ اس کا بھی خیال رکھئے گا۔ میں آپ کو لاکھوں بار پرنام کرتا ہوں *
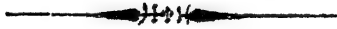
بابو

مہابھارت کا ایک ورق

جینمجے بولے۔ ہے رشی! آپ نے فرمایا تھا۔ کہ کلجگ میں بابو نام کی ایک مخلوق پیدا ہوگی۔ کہئے وہ کس قسم کے آدمی ہونگے۔ اور زمین پر پیدا ہو کر کیا کیا کام کریں گے۔ یہ سُننے کے لئے میرا دل بے چین ہو رہا ہے۔ آپ مہربانی کر کے اِسے بالتفصیل بیان کریں۔

ویشمپائن نے جواب دیا۔ ہے آریہ! میں اُنہیں عجیب غریب عقل والے کھانے اور سونے میں باکمال بابو لوگوں کا حال بیان کرتا ہوں۔ آپ دھیان سے سُنیں۔

ہے راجہ! جو لوگ عجیب طرح کے کپڑے پہنے۔ ہاتھ میں بینت لئے بال سنوارے۔ قیمتی بُوٹ پہنے ہوں گے۔ وُہی بابو ہونگے۔

جنہیں بحث میں کوئی شکست نہ دے سکیگا۔ جو غیر زبان پر لٹو ہونگے۔ مادری زبان کی سخت مخالفت کرینگے۔ وہی بابو ہونگے۔

مہاراج! اسی طرح کے بے شمار عقلمند بابو پیدا ہونے والے ہیں۔ جو اپنی مادری زبان بولنے کے ناقابل ہونگے۔ جن کے پاؤں گوشت اور ہڈی کے بغیر لکڑی کے مانند خشک ہونگے۔ مگر پھر بھی بھاگ سکیں گے۔

ہاتھ دُبلے ہونے پر بھی قلم پکڑنے اور منٹر سمبھالنے کے قابل ہونگے۔ چہرہ نرم ہونے پر بھی جو سمندر پار ولایت کی بنی ہوئی خاص چیز کی چوٹ برداشت کر سکیں گے۔ جن کے سبھی اعضا کی اسی طرح تعریف کی جا سکتی ہے۔ وُہی بابو ہونگے۔ جو بغیر مقصد کے روپیہ جمع کرینگے۔ جمع کرنے کے لئے کمائیں گے۔ کمانے کے لئے تعلیم حاصل کرینگے۔ پڑھ کر پاس ہونے کے لئے امتحان کے پرچوں کی نقل کرینگے۔ وُہی بابو ہونگے۔

مہاراج! اس لفظ بابو کے کئی معنی ہونگے۔ جو کلجگ میں ہندوستان کے بادشاہ ہوکر انگریز نام سے مشہور ہونگے۔ اُن کی لُغت میں بابو کے معنی محرر اور منشی کے ہونگے۔ غریب لوگوں کے نزدیک بابو لفظ کے معنی امیر کے ہونگے۔ مزدور اور ملازم لوگ بابو کے معنی آقا سے لیں گے۔ ان سب کے علاوہ بابو کی مانند زندگی گذارنے کی آرزو رکھنے والے بہت سے آدمی ہونگے میں صرف اُنہیں لوگوں کی تعریف کر رہا ہوں۔ جو اس کے دوسرے معنی لیں گے۔ جنہیں اس مہابھارت کے سُننے کا مہاتم نہ ہوگا۔ وہ بیل کی جُون میں جائیں گے۔ اور بابو لوگوں کی غذا بنیں گے۔

ہے راجن! بابو لوگ اگست رشی کے مانند سمندر کو خشک کر دیں گے۔ کانچ کا گلاس اُن کا ہتھیار ہوگا۔ آگ اُن کے ماتحت ہوگی۔ وہ حقہ اور سگرٹ نامی دو نئے زیوروں کے ذریعہ اُن کے منہ سے لگی رہے گی۔ صرف اتنا ہی نہیں جس طرح اُن لوگوں کے منہ میں آگ ہوگی۔ اُسی طرح اُن کے پیٹ میں بھی آگ لگی رہے گی۔ اور رات کے تیسرے پہر تک اُن لوگوں کی گاڑی کے دو لیمپوں کو جلائے رکھے گی۔ اُس کے ساتھ ہی موسیقی اور شاعری میں بھی اگنی دیوتا موجود رہیں گے۔ وہاں پر اس کی دو شکلیں ہونگی۔

نفس کی آگ اور دل کی آگ۔ رنڈیوں کی صحبت کے باعث اُن کے سر میں بھی آگ رہے گی وہ لوگ ہوا کھایا کریں گے۔ مگر تہذیب کے خیال سے اُس کا نام صبح کی سیر رکھیں گے۔ چندر بھگوان ان لوگوں کے گھر کے اندر اور باہر حاضر رہیں گے۔ مگر سورج اُنہیں کبھی نظر بھی نہ آئیگا۔

ہے لوگوں میں ممتاز۔ جو شعر و سخن کی لذت سے محروم ہوں گے جن کی لیاقت محض بچپن میں پڑھی ہوئی کتابوں تک محدود ہوگی۔ اور جو اپنے آپ کو بے عدیل و بے مثال فاضل اجل سمجھیں گے۔ وُہی بابو ہونگے۔ جو شاعری کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ مگر اس کے باوجود شعر و سخن کی کتابیں پڑھنے اور اُن پر تنقید کرنے کو ہر وقت آمادہ رہیں گے۔ جو رنڈیوں کی چیخ و پکار کو کمال موسیقی سمجھینگے جو اپنی راؤں کو منزہ من الخطاء خیال کرینگے۔ وہی بابو ہونگے۔ جو شکل و صورت کے بھدے۔ صفات میں کورے۔ افعالِ نیک سے نفور۔ مگر گفتگو میں سرسوتی دیوی کے برابر ہونگے۔ وہی بابو ہونگے۔ جو خوشی کے لئے دسہرہ منائیں گے۔ بیوی کے اصرار سے لکشمی پوجا اور آشنا کے اصرار سے سرسوتی پوجا کریں گے۔ جو زبان کی لذت کے لئے قربانی کرینگے۔ وہی بابو ہونگے۔ جو عجیب نشم کے رتھ میں سوار ہونگے۔ جو تنگ و تاریک مکانوں میں رہائش رکھیں گے۔ جو انگوری شراب پی کر بدمست ہونگے۔ وُہی بابو ہونگے۔ جو مہادیو کے مانند نشی اشیاء کا استعمال کرینگے۔ جو برہما کی طرح اولاد پیدا کرنے میں ماہر ہونگے۔ اور جنہیں وشنو کی طرح لیلا کرنے میں کمال حاصل ہوگا۔ وہی بابو ہونگے۔

ہے کورو خاندان میں اشرف۔ یہ لوگ وشنو بھگوان کے ساتھ زیادہ مشابہ ہونگے۔ وشنو بھگوان ہی کی طرح لکشمی اور سرسوتی اُن کے دونو طرف رہیں گی۔ وشنو ہی کی طرح اُن کے بھی دس اوتار ہوں گے۔ کلرک۔ اُستاد۔ سٹیشن ماسٹر

آریہ سماجی۔ مصدی۔ ڈاکٹر۔ وکیل۔ حاکم۔ زمیندار۔ اڈیٹر۔ وشنو بھگوان ہی کی طرح یہ بھی ہر اوتار میں راکشسوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ کلرک اوتار میں یہ دفتری کو ہلاک کریں گے۔ استاد اوتار میں یہ غریب طالب علموں پر مشق کریں گے۔ سٹیشن ماسٹر اوتار میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے والوں پر اُن کا غصہ اُتریگا۔ آریہ سماجی اوتار میں اُن کے راکشس لڈو پیڑا کھانے والے برہمن دیوتا ہونگے۔ مصدی اوتار میں اُن کا شکار بیوپاری بنیں گے۔ ڈاکٹر اوتار میں یہ مریضوں کو مارینگے۔ وکیل اوتار میں مؤکلوں کو ہلاک کرینگے۔ حاکم اوتار میں مقدمے بازوں کی تباہی ہوگی۔ زمیندار اوتار میں رعایا کی شامت آئے گی اڈیٹر اوتار میں بابوؤں کا غصہ بھلے مانس شریف آدمیوں پر اُترے گا۔

ہے مہاراج! اور سنئے جن کی باتیں دِل میں ایک۔ زبان پر دس۔ تحریر میں سو اور لڑائی میں ہزار ہو جائیں گی۔ وہی بابو ہونگے۔ جن کی طاقت بازوں میں ایک گنا۔ زبان پر دس گنا۔ پیٹھ میں سو گنا۔ اور دفتر میں لامحدود ہوگی وہی بابو ہونگے۔ جن کی بچپن کی عقل کتابوں میں۔ جوانی کی عقل بوتلوں میں اور بڑھاپے کی عقل بیوی کے آنچل میں رہے گی۔ وہی بابو ہونگے۔ جن کا خُدا انگریز گورو پیسہ۔ وید اخبار اور تیرتھ نیشنل تھیٹر کا ہال ہوگا۔ وُہی بابو ہونگے۔ جو مشنریوں کے پاس عیسائی۔ آریہ سماجیوں کے پاس آریہ سماجی۔ باپ کے پاس ہندو اور سادھو سنت کے پاس ناستک بن جایا کریں گے۔ وہی بابو ہونگے۔ جو اپنے گھر میں پانی اور دوست کے گھر میں چائے پئیں گے۔ جو رنڈی کے مکان پر گالی اور اپنے مالک کے گھر میں لات گھونسا کھائیں گے۔ وہی بابو ہونگے۔ جو نہاتے وقت تیل سے نفرت کریں گے۔ کھاتے وقت اُنگلی سے نفرت کرینگے۔ اور بات چیت کرتے وقت مادری زبان سے نفرت

کریں گے۔ وہی بابو ہونگے۔ جن کی کوشش صرف لباس پہننے میں۔ جن کی ہمت صرف اُمیدواری میں۔ جن کی بھگتی صرف عورت میں ہوگی۔ وُہی بابو ہونگے۔ جن کو غصّہ صرف اُس وقت آئیگا۔ جب عمدہ کتابیں سامنے آئیں گی۔ وُہی بابو ہوں گے ؎

ہے مہاراج! مَیں نے جن لوگوں کا بیان کیا ہے۔ اُن کو یقین ہوگا۔ کہ وُہ پان کھا کر۔ گالیاں سُنا کر۔ سگرٹ پی کر۔ اور کھچڑی زبان میں لکچر دے کر ہندوستان کو ترقی کے راستے پر ڈال سکیں گے ؎

یہ سُن کر جنمیجے بولے۔ ہے رشی ور! بابو لوگوں کی جے ہو۔ اب کوئی دوسرا بیان شروع کیجئے ؎
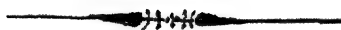
ایک مُقدمے کی سماعت

جب جان ڈکسن صاحب عدالت میں پیش ہوئے۔ تو بہت سے تماشبین جمع ہو گئے۔ ملزم کا نام انگریزی تھا۔ لیکن رنگ عام ہندوستانیوں کی نسبت بھی کالا تھا۔ مقدمہ کی سماعت کرنے والے ایک ہندوستانی ڈپٹی تھے۔ اس پر ملزم بہت ناراض تھا۔ کیونکہ وہ اس زعم میں تھا۔ کہ میں صاحب ہوں۔ اور میرے مقدمہ کی سماعت کا حق کسی ہندوستانی ڈپٹی کو حاصل نہیں۔ ساتھ ہی یہ امید بھی تھی۔ کہ ڈپٹی رعب میں آکر چھوڑ دے گا۔ جب کانسٹبل نے ڈرتے ڈرتے ملزم کو کٹہرے میں کھڑا کیا۔ تو صاحب گرم ہوکر بولے "ہم کو ٹمارا پاس اے لوگ کیسا لایا؟"

حاکم نے جواب دیا "ہمیں کیا معلوم؟ کہ کیوں لایا۔ تم نے کیا کیا؟"

ملزم نے کہا "کچھ بھی کیا ہونا۔ ٹمھارا پاس امارا کوئی بات نہیں ہونا سکتا"

"لیکن یہ کیوں؟"

"ٹم کالا لوگ ہے"

"پھر؟"

"ہم صاحب ہے"

"یہ تو دیکھ رہا ہوں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"تم کیا کہتے ہو؟"

"شکر ہے تم سیدھی زبان بولنے لگے۔"

"جس کی طاقت سے تم مقدمہ کرسکتے ہو۔ کیا تم اُسے نہیں جانتے؟"

"دیکھو زیادہ ٹُم ٹُم نہ کرو۔ ہم جرمانہ کردینگے۔"

"ٹُم آم کو جرمانہ نہیں کرنے سکتا۔ ٹمارا وہی۔ اُسے کیا بولتا ہے وہی؟"

"وہی کیا صاحب؟"

"وہی جسری کیشن۔"

حاکم نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ***Jurisdiction.*** لیکن کیا آپ انگریز ہیں؟"

ملزم نے جواب دیا "آم صاحب ہیں۔"

"رنگ ایسا سیاہ کیوں ہے؟"

"آم لوگ کوئلہ کا کام کرتا ہے۔"

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"

اس پر ملزم ذرا جھنجھلا کر بولا "باپ کا نام سے کوٹ کا کیا مطلب؟"

"تمہیں معلوم ہے؟"

"امارا باپ بہوٹ بڑا آدمی تھا۔ لیکن نام یاد نہیں آتا۔"

"یاد کرو آجائے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"امارا نام صاحب جان ڈکسن۔"

"کیا باپ کا نام ڈکسن نہیں؟"

"ہونے سکتا ہے۔ ڈکسن ہونے سکتا ہے۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مدعی کے مختار نے کہا "حضور اس کے باپ کا نام گود۔ دھن صاحب ہے

ملزم نے غصہ سے کہا "اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے باپ کا نام رام نارائن ہے۔ تمہارا باپ چوڑیاں بیچتا تھا۔ ہمارا باپ بڑا آدمی تھا"

جوش میں صاحب کی زبان سیدھی ہو گئی۔

حاکم نے سوال کیا "تمہارا باپ کیا کرتا تھا؟"

جواب "بڑا بڑا لوگ کا ساڑی کٹراتا تھا"

سوال "کیا کراتا تھا؟"

مختار نے کہا "حضور باجا بجاتا تھا"

اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔ حاکم نے Jurisdiction. کا اعتراض منظور نہ کیا۔ اور مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ مدعی کو طلب کرنے پر ہاتھ میں چاندی کے کڑے پہنے ہوئے کالے رنگ کی ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس سے دریافت کیا گیا "تمہارا کیا نام ہے؟"

جواب "میرا نام شیاما"

سوال "تم کیا کام کرتی ہو؟"

جواب "مچھلیاں بیچتی ہوں"

ملزم نے دخل درمعقولات کرکے کہا "جھوٹا بات۔ یہ سٹکی مچھلی بیچتی ہے"

شیاما نے کہا "سٹکی مچھلی بھی بیچتی ہوں۔ اسی پر تو تم مرے ہو"

حاکم نے پوچھا "تمہاری نالش کاہے کی ہے؟"

جواب "چوری کی"

سوال "کس نے چوری کی ہے؟"

اس پر مدعی نے صاحب کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا "اسی ڈوم کے لڑکے نے"

"آم صاحب سے ڈوم نہیں ہے۔"

حاکم نے پوچھا "کونسی چیز کی چوری کی ہے؟"

جواب۔ ایک مٹھی سُتکی مچھلی کی۔"

سوال "کیسے چرائی؟"

جواب۔ مَیں ٹوکرے میں سجا کر بیچ رہی تھی۔ ایک خریدار آیا۔ اُس سے مَیں بات چیت کرنے لگی۔ اُسی وقت اِس صاحب نے ٹوکرے سے ایک مٹھی مچھلی نکال کر جیب میں ڈال لی۔"

سوال "تب تم کو معلوم کیسے ہوا؟"

جواب۔ اِس کی پاکٹ پھٹی ہوئی تھی۔ اسے یہ بات معلوم نہ تھی مچھلیاں نیچے گر گئیں۔"

یہ بات سُن کر صاحب غصّہ سے کہنے لگے "نہیں یہ بات نہیں۔ اس کا باسکٹ ٹوٹا تھا۔ مچھلیاں اُس سے گری ہیں۔"

شیاما نے کہا "اِس کی جیب سے بھی کچھ مچھلیاں ملی ہیں۔"

صاحب بولے "سو آم دام دے گا۔ بول کر لیا تھا۔"

شہادت سے ثابت ہُوا۔ کہ دراصل صاحب نے مچھلیاں چرائی تھیں حاکم نے ملزم سے جواب طلب کیا۔ صاحب نے کہا "کالے لوگ کے پاس امارا جسری کیشن نہیں۔"

حاکم نے یہ بات منظور نہ کی۔ اور اُسے ایک ہفتہ کے لئے قید کر دیا۔

دو چار روز کے بعد یہ خبر کلکتہ کے ایک اینگلو انڈین روزانہ اخبار کے اڈیٹر تک جا پہنچی۔ اُس نے دوسرے دن اپنے اخبار میں لیڈنگ آرٹیکل لکھا:۔

The wisdom of a Native Magistrate —

A story of lamentable failure of justice and race antipathy has reached us from the mofussil. John Dickson an English gentleman of good birth though at present rather in straitened circumstances had fallen under the displeasure of a clique of designing natives headed by one Shyuma a person, as we are assured on good authority, of great wealth, and considerable influence in native society. He was hauled up before a native Magistrate on a charge of some petty larceny which if the trial had taken place before a European Magistrate, would have been at once thrown out as preposterous, when preferred against a European of Mr. Dickson's position and character. But Babu Shyam Narain the ebony coloured Daniel, before whose aweful tribunal, Mr Dickson had the misfortune to be dragged was incapable of understanding that petty larsenies, however congenial to sharp intellects of his own country have never been known to be perpetrated by

men born and bred on English soil, and the poor man was convicted on evidence the trumpery character of which was probable as well known to the magistrate as to the prosecutors themselves. Tye poor man pleaded his birth and his rights as a European British Subject, to be tried by a Magistrate of his own race. But the plea was negatived for reasons we neither know nor are able to conjecture.

Meanwhile we leave our readers to conjecture from a study of the names Shyam Narain and Shyama whether the tie of kindred which obviously exists between prosecutor and Magistrate has had no influence in producing this extraordinary decision."

یہ لیڈنگ آرٹیکل پڑھ کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے چپراسی بھیج کر شیام نرائن بابو کو طلب کیا۔ غریب براہمن بنگالی لرزتا ہوا صاحب کے ہاں حاضر ہوا ﴿ صاحب نے کہا۔" آپ نے ایک یورپین کو کس طرح سزا دی؟"

ڈپٹی صاحب حیران ہو کر بولے "کس یورپین کو؟"

مجسٹریٹ صاحب نے وہی اخبار بابو شیام نرائن کے ہاتھ میں دیا۔ اور کہا "اسے دیکھئے میرا خیال ہے۔ آپ اسے پڑھ سکیں گے مجھے افسوس ہے۔ کہ تمہاری اس غلطی کی مجھے گورنمنٹ کے پاس رپورٹ کرنی ہوگی"

بابو شیام نرائن نے اخبار دیکھنا شروع کیا۔ صاحب بولے "آپ سمجھے؟"

"جی ہاں! لیکن وہ آدمی یورپین نہ تھا"

"آپ نے کیسے جانا؟"

"اُس کا رنگ نہایت سیاہ تھا"

"تو پھر کیا۔ کیا یہ کہیں قانون میں درج ہے۔ کہ صرف گورا رنگ ہی یورپین کی پہچان ہے؟"

"نہیں صاحب"

"پھر آپ نے کس بات سے یقین کر لیا۔ کہ وہ یورپین نہیں؟"

ڈپٹی صاحب پرانے آدمی تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ وہ بحث میں ضرور جیت جائینگے۔ لیکن یہ جیت جانا اُن کے لئے آفت ہو جاتا۔ اس لئے اُنہوں نے وہی کیا۔ جو ایک چالاک نوکر کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے بحث کا خیال چھوڑ دیا۔ اور بولے "میں آپ کے ساتھ بحث نہیں کرتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اور اس کے لئے مجھے نہایت افسوس ہے"

مجسٹریٹ صاحب بیوقوف نہ تھے۔ دل میں وہ معاملہ کو تاڑ گئے۔ ڈپٹی صاحب کی بات سُن کر بولے "کس بات کا آپ کو افسوس ہے؟"

"یورپین آدمی کو سزا دینے کا"

"کیوں؟"

"اسلئے کہ ہندوستانی کی یہ حماقت ہے۔ کہ وہ یورپین کو سزا دے"

"کیوں حماقت ہے؟"

ڈپٹی صاحب مجسٹریٹ کو ایک ہاتھ خرید سکتے تھے۔ اور دوسرے ہاتھ فروخت کر سکتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا "حماقت اس لئے ہے۔ کہ نہ تو کوئی یورپین جرم کر سکتا ہے اور نہ ہندوستانی حاکم ایمانداری کیساتھ اس کی سماعت کر سکتا ہے"

"کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں"

"نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں جہاں تک ہو سکتا ہے۔ اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف رہتا ہوں۔ میں یہ بات اپنے دیسی بھائیوں کے متعلق معمولی طور پر کہہ رہا ہوں"

"آپ اسے مناسب نہیں سمجھتے۔ کہ ہندوستانی آدمی یورپین لوگوں کے مقدمات کی سماعت کریں"

"یقیناً نہیں۔ میرا یہی خیال ہے"

"میں آپ کی دانائی سے بہت خوش ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر تمام ہندوستانیوں کا یہی خیال ہوتا۔ کم از کم ہندوستانی مجسٹریٹ تو آپ کے مانند ہوتے"

ڈپٹی صاحب نے جواب دیا۔ آپ اس بات کی کیسے امید کر سکتے ہیں جبکہ ڈپٹی کوگوں میں وہ لوگ جو اونچے عہدوں پر ہیں۔ کسی اور ہی رائے کے ہیں"

مجسٹریٹ صاحب بولے "کیا آپ اونچے عہدے پر نہیں؟ آپ تو گورنمنٹ کے پرانے ملازم ہیں؟"

"بدقسمتی سے میری ترقی ہمیشہ ہی نظرانداز ہوتی رہی ہے۔ میں تو اس کے متعلق آپ سے درخواست کرنے کو تھا"

"تم درحقیقت ترقی کے مستحق ہو۔ میں اس کے متعلق کمشنر صاحب کو لکھوں گا"

ڈپٹی صاحب نے دونو ہاتھوں سے صاحب کو سلام کیا۔ اور باہر چلے آئے۔ جنٹ صاحب نے ڈپٹی کو باہر آتے دیکھا تھا۔ اُنہوں نے اندر جاتے ہی مجسٹریٹ سے سوال کیا۔ "آپ اس شخص سے کیا کہہ رہے تھے؟"

مجسٹریٹ صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔ "بڑا دلچسپ آدمی ہے۔"

"کیا بات چیت ہوئی؟"

"وہ احمق بھی ہے اور بدمعاش بھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنے ہموطنوں کی بُرائی کر کے مجھے خوش کرے گا۔"

"تو آپ نے اُسے بتلایا کہ مَیں تمہاری چالاکی سمجھ گیا ہوں؟"

"بالکل نہیں۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مَیں نے اُس سے وعدہ کیا ہے۔ کہ مَیں تمہارے لئے ترقی کی کوشش کرونگا۔ وہ کم از کم مغرور نہیں ہے مغرور آدمی ماتحت ملازم ہو۔ تو کسی کام کا نہیں۔ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ لوگ اپنی لیاقت کا ٹھیک تخمینہ کریں۔"

اِدھر ڈپٹی صاحب باہر نکلے۔ تو ایک دوسرے ڈپٹی صاحب کھڑے تھے۔ اُنہوں نے کہا۔ "کیوں؟ صاحب سے ملنے گئے تھے کیا؟"

"ہاں بھائی بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔"

"مصیبت کیسی؟"

"اُس دن جو اُس ڈوم کے لڑکے کو سزا دی تھی۔ اُسی پر صاحب ناراض تھے۔ کہنے لگے رپورٹ کرونگا۔ مگر میں ترقی کا وعدہ لے آیا ہوں۔"

"واہ وا! آپ نے کمال کیا۔ مگر یہ منتر کونسا پڑھا؟"

"یہی کہ مَیں بالکل احمق ہوں۔ غلطی ہو گئی۔ کوئی ہندوستانی یورپین کے مقدمہ کی سماعت نہیں کر سکتا۔ صاحب خوش ہو گئے۔ ترقی کا وعدہ کر لیا۔"

انسانی معاشرت
پر
ایک شیر کے خیالات

ایک دفعہ سُندربن میں شیر چیتوں اور دیگر اسی قسم کے جانوروں کا جلسہ منعقد ہُوا۔ گھنے جنگل میں جہاں قدرت نے خوبصورت گھاس کا فرش بچھا رکھا تھا۔ وہ سب جمع ہوئے۔ صدر جلسہ ایک بوڑھا شیر منتخب ہُوا۔ جس نے حاضرین کا اس عزت افزائی کے لئے شکریہ ادا کرنے کے بعد حسب ذیل صدارتی تقریر کی :-

"صاحبان! آج کا دِن روزِ سعید ہے۔ کہ ہم جنگل کے رہنے والے۔ گوشت کھانے کے خواہشمند۔ ایک دوسرے کو فایدہ پہنچانے کی غرض سے اور باہمی تبادلہ خیالات کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے۔ کہ ہمارے کمینہ مخالف دِن رات ہم پر یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ کہ ہم میں اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم الگ الگ اور علیحدہ علیحدہ جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن آج کا یہ جلسہ زبانِ حال سے پُکار پُکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ اُن کا یہ خیال سراسر غلط اور قطعی بے بُنیاد ہے۔ اس وقت تہذیب جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے۔ اُس سے معلوم

ہوتا ہے۔ کہ وہ دن دُور نہیں۔ جب ہم تہذیب یافتہ ہستیوں میں ممتاز جگہ حاصل کرینگے۔

صاحبان! اب میں آپ کی توجہ اُس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سندربن کے شیروں میں علم کے چرچے کم ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ہم کو لازم ہے۔ کہ ہم حصولِ تعلیم کے لئے سرگرم سعی کریں۔ کیونکہ آج کل صرف عالموں کی قدر ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ لیکن عنقریب آنے والا ہے جب امتحان کے سرٹیفکیٹ کے بغیر دُنیا میں گزارہ کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اس لئے میں یہ ریزولیوشن آپ اصحاب کے سامنے رکھتا ہوں۔ کہ ہم شیر آئندہ کے لئے تحصیل علم کی جانب زیادہ انہماک سے متوجہ ہوں"

اس تقریر کے خاتمہ پر حاضرین نے اپنی خوفناک آواز میں گرج کر اس ریزولیوشن کی تائید کی۔ اس کے بعد دیگر کئی ریزولیوشن بھی پیش ہو کر پاس ہوئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ اِن سب ریزولیوشنوں کے ساتھ شیر بادشاہوں نے طول طویل تقریریں بھی کیں۔ اُن تقریروں کی شیرینی اور رنگینی کا کیا کہنا۔ چاروں طرف ایک جذبے کا عالم طاری تھا۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے کہا" آپ لوگوں کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ اس بن میں دراز سنگھ نامی ایک بڑے عالم شیر رہتے ہیں۔ اُن کو انسانی طرز معاشرت کے متعلق کمال کی واقفیت حاصل ہے۔ ہم نے اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ آپ کے روبرو اس مضمون پر ایک تقریر کریں۔ جسے اُنھوں نے نہایت مہربانی سے منظور کر لیا ہے۔ مجھے امید واثق ہے۔ کہ آپ صاحبان اُن کے تجربات کو دلچسپی سے سُنیں گے۔ یہ تجربے اُن کی زندگی کی کمائی ہیں"

انسان کا نام سُن کر کئی نئے شیر ممبروں کے مُنہ میں پانی بھر آیا لیکن جلسہ میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے تہذیب کے باعث اُن کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ صدر جلسہ نے دراز سنگھ سے درخواست کی۔ کہ آپ اپنی تقریر شروع کریں۔ دراز سنگھ گرجتے ہوئے اُٹھے۔ اور مسافروں کے دل میں لرزہ پیدا کرنے والی آواز میں لکچر دینے لگے ؛

"صدر نشین جلسہ! شیر بھینو۔ اور بھائیو!!

انسان ایک قسم کا دو پاؤں والا جانور ہے۔ اُس کے پر نہیں ہوتے۔ اِس لئے اُسے پرندہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں چوپائیوں سے وہ بہت مشابہ ہے چوپائیوں میں جو جو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ انسانوں میں وہ سب کی سب پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر انسان کو ایک قسم کا چوپایہ کہہ دیں۔ تو عین درست ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ انسانی جسم کی بناوٹ چوپائیوں کے جسم کی بناوٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ ہم انسان سے نفرت وحقارت کا سلوک کریں ؛

"انسان شکل وصورت میں بندروں سے زیادہ ملتے جُلتے ہیں۔ اہلِ دماغ اصحاب کی رائے ہے۔ کہ ایک نوع کا جانور آہستہ آہستہ دوسری نوع میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا مجھے یقین ہے۔ کہ انسانوں کے بھی دُم نکل آئے گی۔ اور وہ ترقی کرکے بندر بن جائیں گے ؛

"شاید آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ انسان کا گوشت نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے۔ اُس کا شکار کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وجہ یہ کہ وہ نہ ہرن کی مانند تیزی سے بھاگ سکتا ہے۔ نہ بھینسے کی طرح طاقتور ہے۔ نہ اُس کے سر پر سینگ ہیں پرمیشور نے اُس کو ہم لوگوں کی خوراک کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس میں اگر

इलाहाबाद

قدرت کو یہ منظور ہوتا۔ کہ وہ ہمارا کھاجا بنے۔ تو اُسے بھاگنے کی طاقت دی جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہ محض ہم لوگوں کا پیٹ بھرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

"اِن وجوہات سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ اُن کا گوشت نہایت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ ہم انسانوں کو محبت کرتے ہیں۔ مگر تعجب اس امر کا ہے۔ کہ انسانوں کو بھی ہم شیروں میں بڑی عقیدت ہے۔ اس کے ثبوت میں میں اپنے ذاتی تجربات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

حاضرین متوجہ ہو گئے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ بہت عرصہ تک سیاحت کرنے کی وجہ سے میں نے دُنیا کا بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں جہاں رہا کرتا تھا۔ وہ جگہ اس سندربن کے شمال کی طرف ہے۔ وہاں ٹٹو بھینسیں اور دیگر کئی قسم کے جانور بھی رہتے ہیں۔ نیز انسان بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک دن میں وہاں روزی کے لئے گیا ہوا تھا۔"

اس پر ایک شیر نے دریافت کیا "روزی کسے کہتے ہیں؟"

لیکچرار نے جواب دیا "روزی کے معنی ہیں کھانے پینے کی فکر کرنا۔ اسے تہذیب یافتہ لوگ روزی کہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بُرے ہیں۔ ان کی روزی کا ——— پیٹ بھرنے کی فکر کا نام ہے۔ بدمعاشی۔ اُچکاپن اور ذلت۔ جو پاجی ہیں۔ اُن کے روزی کمانے کا نام ہے۔ چوری۔ زبردستوں کے روزی کمانے کا نام ہے ڈاکہ زنی۔ مگر بعض اوقات جو زبردست شخص ڈاکہ زنی سے روزی کماتا ہے۔ اسے بہادری بھی کہا جاتا ہے۔ آپ جب سوسائٹی میں ہوں۔ تو ان مختلف ناموں کو یاد رکھا کریں۔ ورنہ آپ کو وحشی کہا جائیگا۔ مگر

میری اپنی رائے یہ ہے۔ کہ ان سب ناموں کی بجائے صرف ایک نام "پیٹ پوجا" کافی ہے ؂

"خیر میں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ انسان شیروں کے بڑے بھگت ہیں۔ میں ایک دن روزی کے لئے انسانوں کی بستی میں گیا۔ وہاں بانس کی چھت کے نیچے ملائم گوشت والا ایک بکری کا بچہ مجھے اچھلتا کودتا دکھائی دیا۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ میں اُس گھر کے اندر پہنچ گیا۔ مگر اندر پہنچتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔ اُس کے بعد کئی آدمی آ گئے۔ وہ میرا درشن کر کے نہایت خوش ہوئے اور چیخنے چلانے لگے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طریقہ سے وہ نمسکار کیا کرتے ہیں۔ میں صاف سمجھ گیا۔ کہ وہ میرے اعضا کی تعریف کر رہے ہیں۔ بعض بعض آدمی مجھے وہ لفظ کہنے لگے۔ جو بیوی کے بھائی کو کہتے ہیں (سالا) پھر انہوں نے مجھے بمعہ میرے گھر کے بڑی عقیدت اور محبت سے ایک گاڑی پر رکھا۔ اسے نہایت خوبصورت فربہ بدن دو بیل کھینچ رہے تھے۔ اُن کو دیکھ کر میری بھوک چمک اُٹھی۔ لیکن افسوس باہر نکلنے کا کوئی طریق نہ تھا لاچار اُس بکری کے بچے پر قناعت کرنا پڑا۔ اتنے میں گاڑی میرے بھگت کے مکان پر پہنچی۔ وہ میرے خیر مقدم کو خود دروازے پر آیا ہوا تھا۔ اُس نے لوہے کے سلاخوں سے سجا ہوا ایک گھر میرے لئے مقرر کیا۔ اور کھانے کے لئے بکرے کا گوشت روزانہ ملنے لگا۔ وہاں آدمی اکثر جاتے رہتے تھے۔ میرا درشن کر کے اُن کی روح تک خوش ہوجاتی تھی۔ یہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں ؂

"اُس گھر میں میں نے بہت دن تک آرام کیا۔ میری خواہش نہ تھی۔ کہ وہ آرام چھوڑ کر میں جنگل میں واپس لوٹوں۔ لیکن حب الوطنی نے مجھے وہاں

نہ رہنے دیا۔ جس وقت مجھے یہ نرم و سبز گھاس یاد آتی تھی۔ اُس وقت میں ہاؤ ماؤ کرکے گرجنے لگ جاتا تھا۔ اے مادر قدرت تو مبارک ہے۔ تجھے میرا منکار ہو جب تیری یاد آتی تھی۔ تو میں گوشت چھوڑ دیتا تھا۔ اور ادھر اُدھر ٹہل کر انسانوں پر ظاہر کر دیتا تھا۔ کہ تم پر از حد ناراض ہوں۔ ہے جنم بھوم میں جب تک تجھ سے بچھڑا رہا۔ میں نے کبھی بغیر اشتہا کے خوراک نہیں کھائی۔ اور بغیر نیند آئے کے آنکھیں بند نہیں کیں۔ میں اپنی ذہنی اذیت کا اس سے زیادہ ثبوت کیا دے سکتا ہوں۔ کہ میں جب تک اُس خوبصورت گھر میں رہا۔ میں نے اُتنا ہی کھایا۔ جتنا پیٹ میں سمایا۔۔۔ ۔۔اس سے زیادہ ایک دو تین لقمے کھا لیتا تھا۔ اور بس "

"وہ جگہ میں نے کس طرح چھوڑی۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب سمجھ گیا شائد غلطی سے پتہ نہیں کیسے ایک دن میرا نوکر صفائی کرنے آیا۔ تو میرے گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ میں باہر نکلا۔ اور باغ کے مالی کو منہ میں رکھ کر اپنے بن کو چلا آیا"

"ان تمام امور کو جو میں تفصیل سے بیان کر رہا ہوں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ کو یقین ہو جائے۔ کہ میں انسانوں کے درمیان رہ آیا ہوں۔ اس لئے اُنکی معاشرت سے بخوبی واقف ہوں۔ اپنے لکچر میں میں صرف انہی امور کا ذکر کرونگا۔ جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اِدھر اُدھر گشت کرنیوالے لوگ عموماً بے بنیاد قصے سُنا دیا کرتے ہیں۔ میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ ہم لوگ بہت دنوں سے سُنتے آرہے ہیں۔ کہ انسان حقیر اور کمزور جانور ہونیکے باوجود پہاڑ جیسے سر بلند مکان تعمیر کر لیتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے بلا شبہ وہ سر بلند مکانوں میں رہتے ہیں۔ مگر میں نے اُن کو کبھی ایسے مکان

تعمیر کرتے نہیں دیکھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے مکانات تعمیر کر سکتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ جن مکانوں میں وہ رہتے ہیں۔ وہ قدرتی طور پر بنے ہوئے ہیں۔ انسانوں نے اُن میں رہائش اختیار کر لی ہے[۵]۔

"انسان کی خوراک گوشت بھی ہے۔ اور پھل پھول بھی۔ وہ بڑے بڑے درخت نہیں کھا سکتا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے پودوں کو بمعہ جڑ ہوں کے کھا جاتا ہے۔ انسان اُن چھوٹے چھوٹے پودوں کا اتنا شوقین ہے کہ اُنکی کاشت کرتا ہے۔ اور اُن کی حفاظت کے لئے چاروں طرف باڑ لگا دیتا ہے۔ اس باڑ میں مالک کے سوائے کوئی دوسرا انسان نہیں چر سکتا"۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ انسان گھاس کھاتا ہے یا نہیں۔ میں نے کبھی انسان کو گھاس کھاتے نہیں دیکھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گھاس بھی اُسکی خوراک میں شامل ہے۔ کیونکہ گورے اور بعض کالے امیر آدمی اپنی باڑوں میں گھاس بھی پالتے ہیں۔ اس سے میں نے تو یہی نتیجہ نکالا ہے۔ کہ وہ لوگ گھاس کھاتے ہوں گے۔ ورنہ اُنہیں عمدہ گھاس تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات میں نے ایک کالے آدمی سے سُنی بھی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ مُلک کا تو ستیاناس ہو گیا ہے۔ صاحب صوبہ بیٹھے گھاس کھا رہے ہیں۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ بڑے آدمی گھاس کھاتے ہیں۔ جب کوئی آدمی غصہ میں آتا ہے۔ تو عموماً کہا کرتا ہے کہ میں نے کیا گھاس کھائی ہے۔

---

۵ دراز سنگھ کی اس تقریر پر ناظرین حیران نہ ہوں۔ اسی قسم کی دلائل سے میکسمولر نے ثابت کیا ہے کہ قدیم ہندوستانی فن تعمیر سے محض نابلد تھے۔ ایسے ہی دلائل کی بنا پر جیمس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے قدیم ہندو غیر مہذب تھے اور سنسکرت وحشیوں کی زبان ہے۔ درحقیقت مِس شیر پنڈت، دراز انسانی محققوں میں کوئی فرق نہیں۔ مصنف

اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان جس کام کو کرتا ہے۔ اُسے پوشیدہ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ اور جب وہ گھاس کھانے سے چڑھتا ہے۔ غصہ میں آ کر اس سے انکار کر دیتا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ وہ گھاس کھاتا ہوگا۔ ورنہ غصہ کیوں کرتا۔ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔

"انسان حیوانوں کی پوجا کرتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے میری پوجا کی تھی۔ اس کا میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن وہ صرف شیروں ہی کی پوجا نہیں کرتے۔ گھوڑوں کی بھی کرتے ہیں۔ انہیں اپنے مکانوں میں رکھتے ہیں۔ ان کے کھانے کے لئے عمدہ عمدہ اشیاء دیتے ہیں اور ان کے جسم کو بڑی عقیدت سے صاف کرتے ہیں۔ شاید گھوڑے انسانوں سے بڑے ہیں۔ اس لئے ان کی پوجا ہوتی ہے۔

"انسان گئوئیں۔ بھیڑیں اور بھینسیں پالتے ہیں۔ اور آپ یہ سُن کر تعجب کریں گے۔ کہ انسان ان کا دودھ پیتے ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا۔ ہمارے شیر پنڈت یہ رائے قائم کر چکے ہیں۔ کہ انسان پہلے بیل تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ انسانوں اور بیلوں کی عقل حیوانی ضرور ملتی جلتی ہے۔ بہرحال انسان خوراک کی سہولیت کے لئے گوؤں۔ بکریوں اور بھیڑوں کو پالتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا طریق ہے جو بلاشبہ قابل تقلید ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ میں اس سبھا کے سامنے یہ ریزولیوشن پیش کروں۔ کہ ہم لوگ انسانوں کی مشا لائیں جاری کریں۔

"صاحبان! میں کہہ چکا ہوں۔ کہ انسان۔ گئوؤں۔ گھوڑوں۔ بھیڑوں اور بکریوں کو پالتے اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر اس پر بھی قناعت نہ کر کے وہ ہاتھیوں۔ اونٹوں۔ گدھوں۔ کتوں اور بیلوں تک کو پالتے اور

ان کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لئے اگر انسان کو تمام دنیا کی مخلوق کا خدمتگار کہا جائے۔ تو بے جا نہ ہوگا ۔

"انسانی طرز معاشرت کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ ان لوگوں میں بیاہ شادی کا جو طریقہ ہے۔ وہ بڑے تماشہ کا ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ ان کا پالٹیکس بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ آہستہ آہستہ میں ان تمام امور کا ذکر کروں گا۔ ذرا آرام سے سنتے جائیں ۔"

لیکچرار صاحب یہاں تک پہنچنے پائے تھے۔ کہ صدر جلسہ کو کچھ فاصلہ پر ایک ہرن کا بچہ جاتا دکھائی دیا۔ اب ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ شائد اسی دور اندیشی کے باعث ان کو عہدۂ صدارت پیش کیا گیا تھا۔ لیکچرار اداس ہو گئے اور چپ چاپ سوچنے لگے کہ ہماری سوسائٹی کو تہذیب کا خیال نہیں۔ اتنے میں ایک سمجھدار شیر نے کہا ۔

"آپ خفا نہ ہوں۔ صدر جلسہ روزی کے لئے گئے ہیں۔ ادھر سے ہرن کا بچہ گزرا ہے۔ مجھے بھی اس کی بو آ رہی ہے ۔"

یہ سننا تھا۔ کہ مجلس میں کھلبلی مچ گئی۔ اور تمام حاضرین اپنی اپنی دم اٹھا کر اسی طرف دوڑتے ہوئے روانہ ہوئے جس طرف صدر جلسہ گئے تھے جلسہ برخاست ہوا ۔

مضمون کا بقیہ حصہ

اس کے بعد ایک دن پھر جلسہ ہوا جس میں شیر پنڈت نے اپنے مضمون کا بقیہ حصہ ختم کیا۔ آپ نے کہا۔

صدر جلسہ۔ شیر بہنو اور بھائیو!

اپنی پہلی تقریر میں میں نے کہا تھا۔ کہ میں انسانوں کے بیاہ شادی

کے متعلق کچھ کہوں گا۔ چونکہ اپنے وعدے کو پورا کرنا مہذب لوگوں کا فرض ہے اس لئے میں اپنے مضمون کو شروع کرتا ہوں ۔

"بیاہ کیا ہے؟ اس سے آپ ناواقف نہیں۔ ہم لوگ جب کبھی ضرورت ہوتی ہے۔ بیاہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انسانوں کے بیاہ میں ایک خصوصیت ہے۔ ان کا بیاہ عموماً ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے"

"انسانی بیاہ دو قسم کا ہے۔ عارضی اور مستقل۔ لیکن عارضی بیاہ کی ان میں قدر نہیں مستقل بیاہ یا پروہت بیاہ ان میں زیادہ رائج ہے۔ اور اسی کو وہ عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پروہت بیاہ وہ بیاہ ہے جس میں پروہت کو گواہ بنایا جائے"۔

ایک شیر نے دریافت کیا "پروہت کون ہوتا ہے؟"

"ڈکشنری میں لکھا ہے۔ کہ پروہت وہ انسان ہے۔ جو چال بازی کے ذریعہ لڈو پیڑا اور کھیر پوری سے پیٹ پوجا کرے۔ لیکن تمام پروہت کھیر پوری ہی پر قناعت نہیں کرتے۔ بعض ایسے بھی ہیں۔ جو گوشت کھاتے ہیں۔ اور اسے ہضم کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی نہیں۔ کہ جو حلوہ پوری اور کھیر کھائے۔ وہ ضرور ہی پروہت ہو۔ ایک شہر میں کئی سانڈھ ہیں۔ وہ دن رات کھیر پوری کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پروہت نہیں۔ اس کا باعث یہ ہے۔ کہ وہ چال بازی نہیں جانتے پروہت وہ ہے۔ جو چالبازی سے یہ اشیاء حاصل کرے ۔

"پروہت بیاہ میں اسی قسم کا ایک پروہت دولھا اور دلھن کے درمیان بیٹھتا ہے۔ اور کچھ بولتا جاتا ہے۔ اس بولنے کو وہ لوگ منتر کہتے ہیں۔ پتہ نہیں۔ ان منتروں کا کیا مطلب ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے

غور کیا ہے۔ پروہت کہتا ہے:

"اے دولہا اور دلھن! میں حکم دیتا ہوں۔ کہ تم بیاہ کرو۔ کیونکہ تمہارے بیاہ کر لینے سے مجھے روزانہ لڈو پیڑے ملیں گے۔ اس لئے تم بیاہ کر لو

"جب تمہارے ہاں لڑکا بالا ہوگا۔ اس موقع پر مجھے لڈو پیڑے اور کھیر پوری ملے گی۔ اس لئے تم بیاہ کرو

"اس لڑکے کے نام کرن منڈن اور دیگر سنسکاروں میں مجھے کئی قسم کے لذیذ کھانے ملیں گے۔ اس لئے تم بیاہ کرو

"جب تم دنیاداری میں اترو گے۔ برت۔ سندھیا یگیہ وغیرہ کرو گے ان مواقع پر مجھے کھیر پوری ملے گی۔ اس لئے تم بیاہ کرو

"اس بیاہ کو کبھی توڑ نہ دینا۔ کیونکہ اس حالت میں میرا کھیر پوری کا حق زائل ہو جائے گا۔ اس لئے تم بیاہ کرو

"اگر تم نے یہ رشتہ داری توڑ دی۔ تو میں پروہت تمہیں چپیاں مارونگا اور اتنے زور سے مارونگا۔ کہ تم عرصہ دراز تک اسے یاد رکھو گے۔ یہی میرے بزرگوں کے احکام ہیں۔ اس لئے اے دولہا اور دلھن! تم دونو بیاہ کرو"

معلوم ہوتا ہے۔ اسی تشدد کے خوف سے انسان اپنے بیاہ کو ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں میں جو طریق رائج ہے۔ اسے عارضی بیاہ کہا جاتا ہے انسانوں میں بھی یہ بیاہ کہیں کہیں ہوتا دیکھا گیا ہے بعض بعض انسان ایسے بھی ہیں۔ جو پروہت بیاہ بھی کرتے ہیں۔ اور عارضی بیاہ بھی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے۔ کہ پروہت بیاہ سب کے سامنے ہوتا ہے لیکن عارضی بیاہ پوشیدہ طور سے کیا جاتا ہے۔ انسانوں میں ایسا بیاہ اگر ظاہر ہو جائے۔ تو بڑا شور شرابہ مچتا ہے۔ اور بعض وقت ایک انسان دوسرے انسان

کو قتل کر دیتا ہے۔ لیکن تعجب اس امر کا ہے کہ ان میں سے بہت سے انسان خود عارضی بیاہ کرتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو اس جرم پر سزا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے۔ کہ بہت سے انسان دل سے تو عارضی بیاہ کے حق میں ہیں۔ لیکن پروہتوں کے خوف سے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ہاں جو لوگ ذرا مہذب ہو گئے ہیں۔ جن کو ہماری مانند شعور آگیا ہے ان میں ہمارے بیاہ کا بہت شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اغلباً وہ دن دور نہیں جب تمام انسان مہذب ہو جائیں گے۔ اور ان میں ہمارے بیاہ کا طریق رائج ہو جائیگا۔ کئی انسان پنڈت اسکے حق میں کتابیں تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئیے۔ اور اُن کو اپنی سبھا کا آنریری ممبر بنا لینا چاہئیے مجھے یقین ہے۔ کہ آپ انہیں اپنے درمیان دیکھ کر ان کا شکار نہ کرینگے۔ کیونکہ اس سے ہمارے مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

"انسانوں میں ایک اور طرح کا عارضی بیاہ بھی رائج ہوتا ہے۔ اسے پیسہ بیاہ کہا جاتا ہے۔ اس میں پیسہ دے کر ایک انسان دوسرے انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے"۔

ایک شیر نے سوال کیا: "پیسہ کیا ہوتا ہے؟"

"پیسہ انسانوں کا ایک دیوتا ہے۔ اس کی وہ دن رات پوجا کرتے رہتے ہیں۔ انسانوں کے جتنے دیوتا ہیں۔ ان میں پیسہ دیوتا سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔ یہ دیوتا مجسّم ہوتا ہے۔ اس کا ظہور سونے چاندی اور تانبے سے ہوتا ہے (اور آج کل کاغذ سے بھی ہونے لگا ہے) انسان اس کے لئے پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی گھر میں یہ دیوتا موجود ہے تو وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس دیوتا کا پروہت یا وہ شخص جس کے

گھر میں اس دیوتا کا مندر ہوتا ہے۔ انسانوں میں بڑا آدمی شمار ہوتا ہے۔ اور دوسرے انسان اس کے سامنے ہاتھ باندھتے اور سر جھکاتے ہیں۔ اس دیوتا کا پجاری جس کی طرف نگاہ کرم سے دیکھ لیتا ہے۔ وہ نہال ہو جاتا ہے۔

"پیسہ دیوتا بڑا طاقتور دیوتا ہے۔ انسانوں میں کوئی دشوار کام ایسا نہیں۔ جسے یہ آسان نہ کر سکتا ہو۔ نہ ان میں کوئی ایسی شے ہے۔ جو اسے حاصل نہ ہو جاتی ہو۔ یہ دیوتا تمام برائیوں کو خوبیاں بنا دیتا ہے۔ جس کے گھر میں یہ موجود ہے۔ وہاں کوئی برائی نہیں رہ سکتی۔ اور جہاں یہ نہ ہو۔ وہاں خوبی کی مجال ہے۔ کہ قدم بھی بڑھا سکے۔ انسانوں میں شریف وہی ہے۔ جس کے گھر میں یہ دیوتا رہتا ہو۔ اور بدمعاش اسے کہتے ہیں۔ جس کے گھر پر پیسہ بھگوان کی نظر عنایت نہ ہو۔ جس کے پاس پیسہ نہ ہو۔ وہ پنڈت ہونے کے باوجود انسانوں کی رسم کے بموجب جاہل گنا جاتا ہے۔ اور جس کے پاس پیسہ ہو۔ وہ بے وقوف ہونے پر بھی عالم فاضل مانا جاتا ہے۔ ہم جب کہتے ہیں۔ کہ فلاں شیر بڑا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب لیتے ہیں۔ کہ اس کا قد بڑا ہے۔ اس کی طاقت زیادہ ہے۔ لیکن انسان جب کہتے ہیں۔ کہ فلاں آدمی بڑا ہے۔ تو اس سے ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے گھر میں پیسہ ہے۔ بڑے آدمی کے معنے دس ہاتھ والے آدمی کے نہیں ہوتے۔ بلکہ پیسے والے آدمی کے ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی قد کا چھوٹا ہو تو بھی لوگ اسے بڑا آدمی ہی کہتے ہیں۔ اور جس کے پاس پیسہ نہ ہو۔ اس کا جسم موٹا۔ لمبا اور چوڑا ہونے کے باوجود انسانی لغات میں اس کے معنی چھوٹے آدمی ہی کے رہتے ہیں۔

"اس دیوتا کی عظمت سن کر میں نے ارادہ کیا تھا کہ اسے بن میں لا کر

رکھنے کی کوشش کروں لیکن بعد میں جو کچھ سنا۔ اس سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ جو انسانوں میں پنڈت ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ پیسہ بھگوان ہی انسانوں کی تباہی اور بربادی کی جڑھ ہے۔ شیر کبھی شیروں پر حملہ نہیں کرتے۔ بھیڑیئے بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے ہونٹ کاٹنے نہیں لگ جاتے۔ سانپ بھی کبھی ایک دوسرے کے زہر سے مرتے نہیں سنے۔ لیکن انسان انسان کے خون کا پیاسا ہے۔ اس کا باعث یہی دیوتا ہے۔ اسی کے باعث دنیا میں لڑائیاں چھڑتی ہیں۔ خون خرابے ہوتے ہیں۔ ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں۔ اسی کے باعث ملک تباہ ہوتے ہیں۔ سلطنتیں برباد ہوتی ہیں۔ تہذیب ننگی ہو جاتی ہے۔ جب انسان ایک دوسرے کو مار رہے ہوں۔ گھائل کر رہے ہوں۔ اور اذیتیں پہنچا رہے ہوں۔ تو سمجھ لو۔ کہ یہ اسی دیوتا کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے کو روک رہے ہوں۔ ایک دوسرے کی بے عزتی کر رہے ہوں اور ایک دوسرے کو کھا جانے کی فکر میں ہوں۔ تو سمجھ لو۔ کہ اس کی تہ میں اسی پیسہ کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ انسانی سوسائٹی میں ایک گناہ بھی اِس قسم کا ہے یا نہیں۔ جو اس پیسہ کی خاطر نہ ہوتا ہو۔ اس میں مجھے شبہ ہے۔ ان تمام امور کا علم ہونے پر میں نے دل ہی دل میں پیسہ بھگوان کو نمسکار کیا۔ اور اس کی پوجا کا خیال دور کر دیا۔

"لیکن حیرت ہے۔ کہ انسان اس بات کو نہیں جانتے۔ وہ نہایت ہی خوفناک قسم کے ناعاقبت اندیش جانور ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے دن رات گھومتے رہتے ہیں اور سونے چاندی کے زہریلے ٹکڑے جمع کرتے پھرتے ہیں۔ جب ان کا اثر ہوتا ہے۔ تو ان

کے خون میں جوش لہریں مارنے لگتا ہے۔ اور وہ میدانوں میں اکٹھے ہو کر ہتھیاروں سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں۔ اس تباہی کو وہ بہادری کے نام سے پکارتے ہیں۔

"آج اسی پر اکتفا کی جاتی ہے کبھی پھر موقع ملا۔ تو آپ کو انسانی معاشرت کے دیگر پہلو دکھانے کی کوشش کروں گا۔"

اس تقریر پر مجلس میں عش عش ہونے لگی۔ لیکچرار کے بیٹھ جانے پر ایک دوسرا شیر کھڑا ہوا۔ اور گرج کر بولا "میں لیکچرار مہاشہ کا شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ان کی تقریر لغو، بے بنیاد اور جھوٹے بیانات سے پُر ہے۔"

صاحب صدر نے کہا "آپ آرام سے بولیں۔ اس طرح کی غیر مہذبانہ گفتگو کی مہذب لوگوں میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ویسے آپ شریفانہ الفاظ میں چاہیں۔ تو اس سے بھی سخت گالیاں دے سکتے ہیں۔"

معترض نے اپنے قصور کی معافی مانگی۔ اور کہا "جو حکم لیکچرار بڑے ہی لائق اور راست گو ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں سے گو زیادہ تر غلط ہے۔ تاہم ان کی ایک یا دو باتیں بالکل درست ہیں۔ ان کی علمیت میں ہم میں سے کسی کو بھی شبہ نہیں۔ مگر اگر گستاخی نہ سمجھی جائے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ لیکچرار نے بیاہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کو اس بارے میں قطعاً واقفیت نہیں۔ جہاں تک ہماری سوسائٹی کا تعلق ہے۔ بیاہ کی یہ تعریف کی جاتی ہے۔ کہ جب کوئی شیر شیروں کی نسل کی حفاظت کی غرض سے کسی شیرنی کو اپنی رفیقہ بناتا ہے۔ تو اسے بیاہ کہا جاتا ہے۔ لیکن انسانی بیاہ اس طرح کا نہیں ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے۔ کہ انسان فطرتاً کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک انسان کو اپنی حفاظت کے لئے ایک ایک مالک کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے وہ ایک ایک عورت کو اپنی مالکن مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی کا نام ان کی زبان میں بیاہ ہوتا ہے۔ گواہ کو وہ لوگ پروہت کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس بیاہ میں ایک آدمی گواہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے پروہت بیاہ کہا جاتا ہے۔ لائق لیکچرار نے بیاہ منتروں کے جو معنے کئے ہیں وہ بھی ٹھیک نہیں۔ ان کے اصلی معنی یہ ہیں :-

پروہت :- "بولو ہم لوگ کس بات کے گواہ ہوں گے ؟"

دُلھا :- "آپ گواہ رہیں۔ کہ میں نے تاحیات اس عورت کو اپنی مالکن بنائے رکھنے کا عہد کیا ہے ؟"

پروہت :- "کچھ اور ؟"

دُلھا :- "اور عہد کیا ہے۔ کہ میں ہمیشہ اس کے قدموں کا خادم بنا رہونگا۔ اس تمام عرصہ کے دوران میں میرا فرض کمانا اور اس کا کھانا ہوگا ؟"

پروہت :- (دُلھن سے) "کچھ تم کو بھی کہنا ہے کیا ؟"

دُلھن :- "میں نے اپنی مرضی سے اس آدمی کو اپنی خدمت میں لینا قبول کر لیا ہے۔ جب تک طبیعت چاہے گی۔ اسے اپنی خدمت میں رکھوں گی۔ ورنہ لات مار کر باہر نکال دوں گی ؟"

پروہت :- "ایسا ہی ہو ؟"

اسی طرح لیکچرار نے اور بھی کئی جگہ غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً پیسے کو انہوں نے دیوتا قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ پیسہ ایک نشے کا زہر ہے۔ اور چونکہ زہر سے انسان کو بہت پیار ہے اس لئے

اسے جمع کرنے کے لئے وہ دن رات سعی کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں۔ کہ یہ بڑہانک رہا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق میں ذاتی تجربہ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ انسانوں کو پیسہ بھگت دیکھ کر میں نے تصفیہ کیا کہ ایک دن پیسہ کھا کر دیکھوں گا۔ کہ اس کا ذائقہ کس قسم کا ہے۔ اتفاق سے چند دن بعد ہی ایک آدمی کھاتے وقت اس کے کپڑوں سے چند روپے نکل آئے۔ میں نے سب کو نگل لیا۔ دوسرے دن پیٹ میں درد ہونے لگا۔ کیا اب بھی آپ کو پیسے کے زہر ہونے میں شبہ ہے؟"

اس کے بعد چند اور شیروں نے تقریریں کیں۔ ان میں ذاتی تجربات ہی کی بنا پر ہر ایک بات کا بیان کیا گیا تھا۔ آخر میں صاحب صدر نے کہا:-

"اب رات بہت گذر گئی ہے۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس لئے زیادہ نہ کہہ کر میں مختصر طور پر دو چار باتیں کہہ کر کے جلسہ ختم کر دوں گا
"کیونکہ اگر کوئی ہرن کا بچہ سامنے سے گذر گیا۔ تو مجھ سے لیکچر ختم نہ ہو سکیگا۔ لیکچرار کے خیالات آپ نے سُنے۔ یہ کہنا شاید غیر ضروری ہوگا۔ کہ ان کی واقفیت سے فائدہ اٹھانا آپ کے لئے ضروری ہے میرا خیال ہے۔ کہ ان دونو لیکچروں سے آپ پر روشن ہو گیا ہوگا۔ کہ انسان نہایت ہی غیر مہذب جانور ہے۔ اور چونکہ ہم مہذب ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ انسان کو اپنی مانند مہذب بنانے کی پوری پوری کوشش کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو مہذب بنانے کے لئے ہی پرماتما نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر انسان مہذب ہو جائیں گے، تو ان کا گوشت زیادہ لذیذ ہو جائے گا۔ اور وہ زیادہ آسانی سے ہم لوگوں کے قابو میں آجایا کریں گے۔ کیونکہ مہذب ہونے

کے ساتھ ان کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ان کی زندگی کا مقصد محض یہ ہے کہ وہ ہماری خوراک بنیں۔ ہم انہیں یہی تہذیب سکھانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنی خوراک کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔"

اس کے بعد صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا گیا اور جلسہ ختم ہوا۔ سب شیر شاہانہ انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے کسی ہرن کے بچے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

بندروں کے خیالات

جس میدان میں یہ جلسہ ہو رہا تھا۔ اس میں بڑے بڑے اور گھنے درخت تھے۔ ان درختوں پر چڑھ کر کئی بندر سانس روک کر بیٹھے ہوئے شیروں کے لیکچر سن رہے تھے۔ شیروں کے چلے جانے پر ایک بندر نے باہر منہ نکال کر دوسرے سے پوچھا۔ "کیوں بھائی۔ ڈال ہی پر ہو نا"

دوسرے نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

"تو آؤ ان کے لیکچروں پر ذرا تنقید کریں"

"کیوں؟"

"یہ ہمارے دیرینہ دشمن ہیں۔ اس لئے ذرا ان کے خلاف بول لیں گے تو پیٹ ہلکا ہو جائے گا"

"واقعی! یہ نہایت ضروری ہے۔ اس سے ہماری قوم کو بہت فائدہ پہنچیگا"

"تو ذرا دیکھ لو۔ کوئی شیر کہیں قریب تو نہیں"

"قریب تو نہیں۔ لیکن پھر بھی ہم کو احتیاط کرنی چاہئے"

بالکل درست۔ ورنہ کسی دن مارے جائیں گے"

پہلے بندر نے کہا۔ "اچھا بولو۔ ان کے لیکچروں میں کیا کیا نقص تھے"

دوسرے نے جواب دیا۔ "ایک تو ان کی گرامر درست نہیں۔ جس طرح ہمارا

نقطہ نقطہ درست ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا نہیں ہوتا۔ وہ تو قدم قدم پر غلطیاں کر جاتے ہیں۔"

"اور"

"اور ان کی زبان بڑی غت ربود ہے۔"

"بلا شبہ وہ بندروں کی زبان سے مطلقاً ناآشنا ہیں۔"

"ایک شیر نے کہا تھا۔ کہ شیروں کا فرض ہے۔ کہ پہلے انسان کو مہذب بنالیں۔ بعد میں خوراک کے طور پر استعمال کریں۔ اگر وہ اسے اس طرح کہتا تو درست ہوتا۔ کہ پہلے خوراک کے طور پر استعمال کریں۔ بعد میں مہذب بنائیں۔"

"آپ کا خیال سولھوں آنے درست ہے۔"

"کس طریقہ سے لیکچر دینا چاہئے۔ اور اس میں کیا کیا کہنا چاہئے۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہے۔ لیکچر میں کچھ کچ مچ کیا جاتا ہے۔ ایک دو دفعہ اچھلا کودا جاتا ہے۔ پھر پکے ہوئے کیلے کھائے جاتے ہیں۔ اور بس۔ شیروں کو چاہئے کہ وہ اس پہلو میں ہماری شاگردی اختیار کریں۔"

"اگر ایسا ہو۔ تو چند دن کے بعد ہی وہ بندر بن جائیں۔"

اس وقت تک اور بندر بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ لیکچرار کے لیکچر میں سب سے بڑا نقص یہ تھا۔ کہ اس نے کئی باتیں اپنی عقل سے جان کر کہی ہیں۔ اور وہ باتیں کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ جو ہمارے بزرگوں نے لکھی ہیں۔ .... اور چونکہ شیروں نے ایسی باتیں ہی کہیں ہیں۔ اس لئے وہ بے بنیاد ہیں اور ایسا کہنا گناہ عظیم ہے۔"

"ایک اور بندر نے کہا "میں اس لیکچر میں ہزاروں نقص نکال سکتا ہوں۔ کئی مقامات پر مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ جو ہم بندر بھی نہ سمجھ سکیں۔ وہ کبھی درست نہیں ہو سکتا"

ایک اور بندر بولا "میں کوئی خاص نقص تو نہیں دکھا سکتا۔ لیکن ہاں میں باون قسم کے منہ بنا سکتا ہوں۔ اور اس سے دگنی تعداد میں گالیاں دے سکتا ہوں۔ کیا لیکچرار میں یہ دم خم ہے۔ میں اُسے چیلنج کرتا ہوں۔ کہ وہ میرے ساتھ اس علم میں مباحثہ کرے"

پتہ نہیں۔ یہ تنقید کتنا طول کھینچی۔ کہ اتنے میں ایک بسیار خور بندر نے یہ کہہ کر اس کو ختم کر دیا۔ کہ "ہم نے لیکچرار شیر کی اس قدر جزبلی ہے۔ کہ وہ گھر جا کر ضرور مر جائے گا۔ آؤ اب ہم کیلے کھائیں"
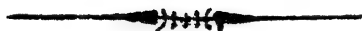
رامائن

(ایک یورپین نقاد کی نگاہ میں)

میں نے رامائن نامی کتاب شروع سے آخر تک دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی ہے۔ شاعری کے لحاظ سے وہ تھرڈ کلاس یورپین شاعروں کے مانند ہے۔ اور فی الحقیقت یہ بات ایک ہندوستانی کے لئے قابل فخر و ناز ہے۔ مجھے یقین واثق ہے۔ کہ اگر اس کا مصنف کچھ عرصہ اور مشق سخن کرتا۔ تو اچھا شاعر بن جاتا ؛

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ بندروں کی عظمت کا اظہار کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بندر لوگ موجودہ زمانہ کے BOERWAL بوروال نامی قوم کے بزرگ تھے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آریوں نے بندروں کی امداد سے کس طرح راکشسوں کو تباہ و برباد کیا۔ آریہ لوگ غیر مہذب اور راکشس شائستہ قوم کے افراد تھے ؛

شاعر نے اپنی کتاب میں کم عقلی کے نقائص اور ان کے خوفناک نتائج دکھانے کی کوشش کی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک بے وقوف راجہ کی چار رانیاں تھیں۔ ان سب کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ راجہ کی جان عذاب میں آگئی،

لیکن یہ سب کچھ پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس کی رانیوں میں کیکئی سب سے زیادہ عقل مند تھی۔ اس نے اپنی عقل مندی سے اپنے سوتیلے بیٹے رام داس کو بن باس دلا دیا۔ اور اپنے بیٹے بھرت کیلئے حکومت کا رستہ صاف کر لیا۔ لیکن یہ بڑا بھائی بھی نکما ہی نکلا ہندوستانیوں میں جو سستی اور آرام طلبی کا مادہ قدرت نے روز ازل ہی سے بھر دیا ہے اس سے وہ بھی محروم نہ تھا۔ اس نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش نہ کی۔ اور بزدلوں کے مانند چپ چاپ جنگل کو بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ جب مسلمان بادشاہ اورنگ زیب کا مقابلہ کیا جائے تو اس سوال کا صاف جواب مل جاتا ہے۔ کہ اتنا عرصہ مسلمان ہندوؤں پر کس طرح حکومت کرتے رہے ہیں۔ جنگل کو جاتے وقت رام داس اپنی بیوی سیتا کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ اس کا نتیجہ وہی ہؤا۔ جو ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی عورتیں فطرتاً تلون مزاج ہیں۔ سیتا کی سوانح عمری اس کی ایک بیّن دلیل ہے۔ وہ جنگل میں جا کر ایک اور شخص ——— لنکا کے راجہ راون کے ساتھ چلی گئی۔ اس کا خاوند روتا ہؤا ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہندو لوگ اپنی عورتوں کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔

ہندو کیرکٹر کا ایک اور نمونہ رامائن میں لکشمن پیش کیا گیا ہے۔ اس کو جس طرح سے مصنف نے PAINT کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بہادر اور من چلا تھا۔ میرا خیال ہے۔ کہ اگر وہ ہندوستان کے بجائے کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوتا۔ تو یقیناً ایک بڑا آدمی بن جاتا لیکن رامائن سے پتہ لگتا ہے۔ کہ اس نے ایک دن بھی بڑا آدمی بننے

کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس نے اپنی زندگی کو بھائی کے پیچھے پیچھے پھرنے میں برباد کر دیا۔ اپنی ذاتی ترقی کے لئے اس نے شمہ بھر کوشش بھی نہیں کی۔ ہندوستانیوں کی فطرت ہی کچھ اس قسم کی ہے ؛

ایک اور بے وقوف بھی ہے ——— بھرت۔ اسے حکومت ملی۔ لیکن اس میں اتنی قوت نہ تھی۔ کہ اُسے سنبھال سکتا۔ اس لئے اس نے پھر یہ بوجھ اپنے بڑے بھائی ہی کے سر پر ڈال دیا۔ رامائن میں اِسی قسم کے کمزور بازو اور بزدل لوگوں کے حالات دیئے گئے ہیں جب رام کی بیوی راون کے ساتھ چلی گئی۔ تو بندروں نے اس کی حالتِ زار پر رحم کھا کر راون کو ہلاک کر دیا۔ اور سیتا اس کے رنجیدہ شوہر کے پاس پہنچا دی گئی۔ لیکن غیر مہذب قوم کی عادت کہاں جاتی ؟ ایک دِن غصّے میں وہ اُسے جلا ڈالنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر غریب خوش قسمت تھی۔ اِس دن تو بچ گئی۔ لیکن گھر آ کر دو چار دن بھی آرام سے نہ رہنے پائی تھی۔ کہ لوگوں کے صلاح مشورے سے رام نے اسے گھر سے نکال ڈالا۔ کئی سال کے بعد بیچاری کھانا پینا نہ ملنے کے باعث پھر رام کے پاس واپس آئی۔ لیکن رام کو اس پر رحم نہیں آیا۔ بلکہ اسے دیکھ کر رام کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے اسی وقت زندہ سیتا کو زمین میں دفن کرا دیا۔ وحشی قومیں اسی طرح کی سزائیں دیا کرتی ہیں۔ یہ ہے رامائن کا اصل مضمون ؛

یہ کتاب تیار کیسے ہوئی ؟ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ رائے قایم کرنا دشوار ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ اس کے مصنف کا نام والمیکی ہے۔ لیکن اس نام کا آدمی کبھی ہُوا بھی ہے یا نہیں ——— اس میں

بھی شبہ ہے۔ والیمکی والیمیک لفظ سے نکلا ہے۔اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔کہ کسی والیمک[1] میں پڑی ہوئی یہ کتاب ملی ہوگی۔اس لئے اس کا نام والیمکی ہو گیا۔اب دیکھنا چاہئیے۔کہ اس کے متعلق کیا رائے قایم کی جا سکتی ہے؟

میں نے رامائن پر ایک اور کتاب ہندی میں بھی دیکھی ہے۔اسے کسی شخص تلسی داس نامی نے بنایا ہے۔دونو کتابوں کا مضمون ملتا جلتا ہے۔اس لئے یہ کہنا مشکل نہیں۔کہ والیمکی رامائن تلسی داس کی رامائن کا ترجمہ ہے۔میں تسلیم کرتا ہوں۔کہ میرے پاس اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے زیادہ وزن دار ثبوت نہیں۔لیکن ایک دلیل ایسی ہے۔جس کی تردید کرنے کی جرأت کوئی باہوش شخص نہیں کر سکتا۔اور وہ اس کتاب کا نام ہے۔اس کتاب کا نام رامائن ہے۔اور جو سنسکرت جانتے ہیں۔وہ تسلیم کریں گے۔کہ رامائن کے سنسکرت میں کوئی معنے نہیں لیکن ہندی میں آکر یہ سوال آن واحد میں حل ہو جاتا ہے۔لفظ رامائن" رامایون" کا مخفف ہے۔رامائن میں واؤ حذف کر دی گئی ہے۔شاید تلسی داس نے کسی یون (مسلمان) شخص راما کی سوانح عمری کو قلمبند کیا۔اور اسے کسی نے سنسکرت میں ترجمہ کر کے والیمک (سانپ کے بل) میں چھپا دیا۔اس لئے اس کا نام والیمکی ہو گیا۔

رامائن کی میں نے جو کچھ تعریف کی ہے۔اس سے زیادہ کرنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے۔اس کی وجہ یہ ہے۔کہ یہ کتاب الف سے لے کر

[1] یعنی۔سانپ کے رہنے کا بل [2] ناظرین حیران نہ ہوں۔یوروپین علماء اسی طرح کی دلائل کی بنا پر تحقیقات کیا کرتے ہیں؟

سے تک خرافات سے پُر ہے۔ اس کا طرز بیان غیر مہذبانہ ہے۔ سیتا کا بیاہ، اسے راون کا لے جانا، رام کا اسے زمین میں دبا دینا اگر ناشائستہ نہیں تو اور کیا ہے۔ جہاں کہیں لکشمن کا ذکر آتا ہے۔ وہاں دلاوری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور جہاں رشی منیوں کا بیان ہے۔ وہاں مذاق کا رنگ غالب ہے۔

ایک بات اور۔ رامائن کی زبان اغلاط سے پُر ہے۔ ان کی صحت کرنا آسان نہیں۔ مثلاً رامائن میں ایک باب ایسا ہے۔ جس میں کسی یودھا (بہادر) کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کا نام ایودھیا کانڈ ہے مصنف نے اسے "ایودھا کانڈ" کی بجائے "ایودھیا کانڈ" لکھ دیا ہے۔ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں اس قسم کی غلط سنسکرت ایک عام بات ہے۔ اسے ہندوستان کے پنڈت نہیں جانتے تھے۔ یہ بات اب تک پردہ راز میں تھی۔ یوروپین محققین نے اسے بے نقاب کر دیا ہے۔
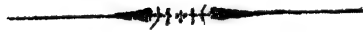
جب میں بھنگ پی لیتا ہوں

جب میں بھنگ پی لیتا ہوں ۔ تو مجھے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ جس سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ دنیا ایک بڑا سا درخت ہے اور اس میں ہر ایک انسان پھل کی جگہ ڈال سے لٹکا ہوا ہے۔ جو پک کر گر پڑتا ہے۔ لیکن بعض پھل ایسے بھی ہیں۔ جو پکنے سے پیشتر ہی آندھی کے زور سے ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں بعض میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ بعض کو شریر پرندے کتر جاتے ہیں۔ لیکن جنم انہیں کا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ جو وقت پر پک کر تیار ہوتے ہیں۔ اور توڑ کر گنگا جل میں دھونے کے بعد برہمن دیوتاؤں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ بعض پھل پک کر خود بخود زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اور انہیں گیدڑ وغیرہ کھا جاتے ہیں۔ ان کا جنم ہی بے فایدہ جاتا ہے۔ بعض پھل کڑوے ہوتے ہیں ان سے ادویات تیار ہوتی ہیں۔ بعض زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جو کھاتا ہے وہی مر جاتا ہے۔ بعض خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان میں سوائے اس کے اور کوئی صفت نہیں ہوتی +

. . . .

جو بڑے آدمی ہیں وہ کٹہل کے پھل ہیں۔ ان میں سے بعض میں ریشے

لٹکتے رہتے ہیں۔ بعض کے اندر لکڑی کا گودا بھرا ہوتا ہے۔ وہ صرف جانوروں کے کام آتے ہیں۔ ان میں بعض پک جاتے ہیں۔ بعض ہمیشہ کچے رہتے ہیں۔ مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ کہ بعض ایسے بھی ہیں۔ جو چاہیں تو پک سکتے ہیں۔ لیکن وہ پکتے نہیں زمین کا دیو انہیں توڑ کر اپنی ترکاری بنا لیتا ہے۔ ان پھلوں کی سلامتی اسی میں ہے۔ کہ وہ بلند ٹہنی پر لگے ہوں ورنہ گیدڑ توڑ لیتے ہیں۔ ان گیدڑوں کو لوگ دیوان، گماشتہ، کارندہ، منیم کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ جب کٹھل پک جاتا ہے۔ تو مکھیاں آجاتی ہیں وہ کٹھل کا رس مانگتی ہیں۔ ایک مکھی کہتی ہے۔ دیکھو مجھ کو بیٹی کا بیاہ کرنا ہے۔ ذرا سا رس دے دو تو کام بن جائے۔ دوسری کہتی ہے۔ کہ مجھے اپنے باپ کا شرادھ کرنا ہے۔ تھوڑا سا رس دے دو۔ تیسری بولتی ہے۔ میں نے ایک کتاب تیار کی ہے۔ چند قطرے ٹپکا دو۔ چوتھی کہتی ہے۔ میں نے اخبار نکالا ہے۔ ذرا مہربانی کر دو۔ پانچویں کہتی ہے۔ میں تمہاری بوا کے جیٹھ کے لڑکے کی سالی کی بھانجی ہوں۔ میری طرف بھی دھیان رکھنا۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ کٹھل کا رس کسے دیا جائے۔ گھر میں رہا۔ تو بدبو پھیل جائے گی۔ میری رائے ہے۔ کہ رس کی کھیر بنا کر براہمن کو کھلا دینی چاہئے۔ تاکہ کٹھل کی نجات ہو جائے۔

. . . .

انڈین سول سروس کے صاحب لوگ مجھے آم معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے۔ کہ آم اس ملک کا میوہ نہیں۔ سمندر پار سے کوئی مہاترا اسے ہندوستان میں لے آئے تھے۔ آم دیکھنے میں رنگین اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ کچے کھٹے ہوتے ہیں۔ لیکن پک کر شربت کے گھڑے بن جاتے ہیں۔

مگر اس وقت بھی ان کی گٹھلی ضرور ترش رہتی ہے۔ وہ میٹھی نہیں ہوتی۔ اور بعض آم تو ایسے واہیات ہوتے ہیں۔ کہ پک کر بھی کھٹے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان کا رنگ دیکھ کر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ بعض پہلے میٹھے ہوتے ہیں۔ بعد میں پھیکے رہ جاتے ہیں۔

عام طور پر لوگ آم کھانے کے طریقہ سے ناواقف ہیں۔ ٹہنی سے توڑ کر فوراً کھا لینا ٹھیک نہیں ——— ان میں گرمی بھری ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں نرمی کے سرد پانی ہیں یا اگر ہو سکے۔ تو تھوڑی سی خوشامد کی برف بھی اسمیں ملا کر ٹھنڈا کر لینا چاہئے۔ پھر کچھ نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔

. . . .

عموماً عورتوں کو کیلوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں۔ مجھے تو کیلے کی پھلیوں اور عورتوں میں ذرا بھی یکسانیت نہیں دکھائی دیتی۔ کیا عورتوں کے گچھے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں کیلے کی پھلیوں اور عورتوں میں ایک مشابہت ہے ——— بندر دونوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے صرف اسی مشابہت کے باعث عورتوں کو کیلے کی پھلیاں کہنا ان پر ظلم کرنا ہوگا۔ اگر مجھ سے پوچھو۔ تو میں عورتوں کے برابر کسی شے کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ لیکن جب بھنگ پی لیتا ہوں۔ تو کیا دیکھتا ہوں ——— کہ عورتیں ناریل کے پھل ہیں۔ وہ پیدا تو گچھوں میں ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کو ایک ساتھ کوئی نہیں توڑتا۔ یہ گناہ کلین براہمنوں ہی کی قسمت میں لکھا ہے[1]۔

[1] بنگال میں برہمن لوگ کئی کئی شادیاں کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب یہ رسم بد بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔

عام ناریل کی مانند اس ناریل کی بھی کئی حالتیں ہوتی ہیں۔ اوّل
اوّل دونوں کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ بالکل محبت کا سوتا۔ جس طرح ناریل
کے پانی سے کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی لڑکی کی حقیقی اور
نفسانی آلودگیوں سے پاک محبت سے دل پر جذبے کا عالم طاری ہو جاتا ہے
اور آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ لیکن دیکھنا اس کچے گچھے کو نہ توڑ لینا۔
حکما کہتے ہیں۔ ان میں گرمی کی شدت ہوتی ہے۔ جنہوں نے دنیا اور دنیاداری
کے فرائض نہیں سیکھے۔ ایسی کچی لڑکیوں کو دل نہ دے بیٹھنا۔ نہیں تو تمہارے
کلیجے میں بے چینی اور عذاب کی آگ لگ جائے گی۔ انہیں اول تجربہ اور
تعلیم کے پانی میں بھگو لو۔ نہیں تو ساری عمر روتے رہو گے۔

. . . .

ناریل میں چار چیزیں ہیں۔ پانی، گری، خول اور بیرونی ریشے۔ میرے
خیال میں ناریل کا پانی اور عورتوں کی محبت دونو برابر ہیں ——— دونو
سے دل ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جب تم دنیاوی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد کی
آگ میں جل رہے ہو۔ تو اس پانی کو پیو۔ تمہاری جلن مٹ جائے گی۔
ذرا سوچو تو سہی۔ تمہارے افلاس کے جیٹھ میں۔ کسی کی موت کے بیساکھ
میں تمہاری مصیبت کی دوپہر میں اور بیماری کے تیسرے پہر میں تمہارے
دل کو اور کس شے سے اطمینان مل سکتا ہے۔ ایسے اوقات میں تمہیں
ماں کی شفقت، بیوی کی محبت اور بیٹی کی عقیدت کے سوا اور کس چیز سے
راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

لیکن ناریل پک جانے پر اس کا پانی قدرے ترش ہو جاتا ہے۔ موہن
کی ماں کی عمر پک جانے پر موہن کا باپ اسی ترشی کے باعث ترک وطن پر

مجبور ہو گیا تھا ۔

... ...

ناریل کی گری اور عورتوں کی عقل دونو برابر ہیں۔ جب کچی ہوں ۔ تو بہت شیریں ہوتی ہیں۔ مگر پک جائیں۔ تو سخت ہو جاتی ہیں۔ پھر کس کی مجال ہے۔ کہ اس کی عقل کو توڑ سکے۔ اس وقت یہ سختی خانہ داری کہلاتی ہے۔ ذرا دیکھنا! ایک طرف لڑکی بیٹھی ہے۔ اس کی دلی آرزو ہے۔ کہ ماں کے زیوروں میں سے ایک آدھ میں بھی پہن لوں۔ لیکن گرمی سخت ہے۔ بیٹی کے دانت نہیں لگ سکتے۔ دوسری طرف بیٹا بیٹھا اس کی دولت کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن ماں کب نزدیک آنے دیتی ہے۔ دل میں خیال آگیا۔ تو ایک جوتی دے دی۔ ورنہ موج کرے۔ شوہر نے بڑھاپے میں کچھ روزگار کرنا چاہا۔ لیکن ہاتھ خالی ہے۔ روپے بیوی کے پاس ہیں ۔ خاوند نے دو تین دفعہ یہ اخروٹ کھانا چاہا۔ لیکن دانت ٹوٹ گئے۔ اخروٹ پر اثر نہیں ہؤا۔ اور اگر کسی طرح دانت گڑ بھی گئے۔ تو اب اخروٹ کا ہضم ہونا دشوار۔ جب تک وہ روپے واپس نہیں کر دیتے۔ تب تک بدہضمی کے باعث رات کو نیند نہیں آتی ۔

... ...

اس کے بعد ناریل کا خول لیجئے۔ یہ عورتوں کی تعلیم ہے۔ جس طرح ناریل کا خول کسی عمدہ مصرف کا نہیں ۔ اسی طرح عورتوں کی تعلیم بھی خاص مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ میری سمر ول نے سائنس کی ایک کتاب لکھی ہے۔ جارج ایلیٹ نے ناول تصنیف کئے ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں نے بھی اس باب میں ناموری حاصل کی ہے۔ کتابیں اچھی ہیں۔ لیکن خول سے بڑھ کر

نہیں ؛

مگر اب وقت بدل گیا ہے۔ پُرفن کاریگر اس خول کے پیارے پیارے قیمتی بٹن اور خوبصورت کھلونے تیار کرنے لگے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی عورتوں کی تعلیم سے بھی بہت سے کام لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر خول کی دھار تیز ہو۔ تو ہاتھ لہولہان ہو جاتا ہے۔ اس لئے یو۔ پ میں مرد گھبرائے ہوئے ہیں۔ عورتیں پارلیمنٹ پر چڑھائی کرتی ہیں۔ اینٹیں اور پتھر پھینکتی ہیں۔ اور شیشے توڑ دیتی ہیں ؛

. . . .

باقی رہ گئے ناریل کے ریشے۔ یہ عورتوں کا حُسن ہے۔ جس طرح ریشے ناریل کے باہر رہتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا حُسن باہر کی شے ہے۔ دونو بے بُنیاد ہیں۔ دونو جلا دینے کے قابل ہیں۔ ہاں ناریل کے ریشے ایک کام آتے ہیں۔ ان سے مضبوط رسّے تیار ہو سکتے ہیں۔ جن سے جہازوں کو کھینچا جاتا ہے۔ عورتوں کے حُسن کی رسیوں سے بھی بیشمار جہاز کھینچے جاتے ہیں میں یہ تو جانتا نہیں۔ کہ کبھی کسی نے ناریل کے رسّوں میں گردن پھنسا کر خودکشی کی ہے کہ نہیں۔ مگر مجھے اتنا ضرور معلوم ہے۔ کہ عورتوں کے حُسن کے رسّے سے اتنے لوگ خودکشیاں کرتے ہیں۔ کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میری تجویز ہے۔ کہ جب جہازوں کا کوئی قانون وضع کیا جائے تو اس میں کوئی دفعہ ایسی ضرور ہونی چاہیئے۔ جس کے رُو سے لوگ اس رسّے میں گردن پھانسا کر ہلاک نہ ہوں ؛

. . . .

آج کل قوم پرست بہت ہو گئے ہیں۔ میں جب بھنگ پی لیتا ہوں

تو وہ مجھے سمیرو کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔ جب یہ کھلتے ہیں۔ تو دیکھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے لیکن مجھے اس گنجے درخت پر یہ بہار دیکھ کر زہر چڑھ جاتا ہے۔ ان میں نہ خوشبو ہے۔ نہ کسی قسم کا شہد۔ ان میں ملائمت بھی نہیں ہوتی۔ نہ اس درخت میں کبھی پھل آتے ہیں۔ چیت کا مہینہ آنے کے ساتھ ہی وہ جھڑنے لگ جاتے ہیں۔ اور ان کے اندر سے ذرا ذرا سا پھوس نکل کر چاروں طرف اڑنے لگ جاتا ہے۔ یہ ان کی "نیک نامی" ہوتی ہے۔

. . . .

میں جب بھنگ پی لیتا ہوں۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہمارے پنڈت اور عالم فاضل لوگ دھتورہ ہیں۔ ان کے پھول اُن کے لمبے لمبے قول ہیں۔ جو پھل کے وقت کانٹے دار دھتورہ رہ جاتے ہیں۔ میری مدّت سے خواہش تھی۔ کہ ایک دفعہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھا کر اپنے برہمن جنم کو سپھل کروں لیکن ان کانٹے دار دھتوروں نے کچھ کرنے نہیں دیا۔ دھتورے میں خوبی یہی ہے۔ کہ وہ نشی اشیاء کے اثر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے مصنّف لوگ اپنے مضامین میں پنڈتوں کے مقولے نقل کر دیتے ہیں۔ تاکہ نشہ میں اضافہ ہو جائے۔

. . . .

میں اپنے ملک کے مصنفوں کو املی سمجھتا ہوں۔ ان میں صرف کھٹائی ہی کھٹائی ہوتی ہے۔ اگر املی دودھ سے چھو بھی جائے۔ تو دودھ خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس سے دہی بنایا جائے۔ تو کھٹا بنتا ہے۔ اسی طرح ہمارے زیادہ تر مصنفوں میں بھی کھٹائی کا گن ہے۔ یہ پھاڑنا

خوب جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور صفت بھی ہے۔ یہ بالکل جڑ ہوتے ہیں۔ املی کی جڑ کی مانند یہ ریویو کی آگ میں بڑی آسانی سے بھسم ہو جاتے ہیں۔ سچ کہنے میں ڈر کا ہے کا۔ امر واقعہ تو یہ ہے۔ کہ املی جیسی واہیات شے دنیا میں نہیں ہے۔ تھوڑی سی کھا لو بدہضمی شروع۔ اور اگر زیادہ کھا جاؤ۔ تو کئی امراض پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ جو ذرا صاحب بن گئے ہیں۔ اور میز کرسی پر بیٹھ کر گیس یا بجلی کی روشنی میں کریم بخش خانساماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی حاضری کھانے لگ گئے ہیں۔ وہ اس وقت سے بچ گئے ہیں۔ ان کو املی کا خطرہ نہیں۔ لیکن جو بیچارے چھپر کے نیچے بیٹھ کر رام دیوی کے ہاتھ کی روٹی کھاتے ہیں۔ ان کے اندیشوں کا شمار نہیں۔ رام دیوی شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ وہ صبح اٹھ کر روزانہ غسل کرتی ہے۔ رام نامی دوپٹہ اوڑھتی ہے۔ لیکن ارہر کی دال بھات اور املی کی چٹنی کے سوائے اور کچھ بنانا نہیں جانتی کریم بخش ذات کا نیچ ہے۔ مگر کھانا بڑا عجیب بناتا ہے[۵۱]۔

. . . .

اب صرف ایک قسم کے انسانوں کو تشبیہہ دینا باقی رہ گیا۔ یہ دیسی حاکم لوگ کونسا پھل ہیں۔ جب میں بھنگ پی کر سمادھی لگاتا رہوں۔ تو جواب ملتا ہے۔ کہ یہ دیسی حاکم کدو ہیں۔ انہیں اگر چھپر پر چڑھا دیا جائے۔ تو وہاں بڑھتے رہتے ہیں۔ ورنہ زمین پر لوٹتے پھرتے ہیں۔ ذرا آندھی

[۵۱] مطلب یہ کہ ہم لوگ اچھا لکھنا نہیں جانتے۔ ذات کے گھمنڈ میں رہتے ہیں انگریزوں کو ہم اپنے جیسا "شدہ پوتر" نہیں سمجھتے لیکن ان کا لٹریچر بڑے معرکہ کا ہے۔ اس میں منشی اشیا کی آمیزش نہیں ہوتی۔

چلے۔ تو بیل سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض تو شکل و صورت میں بھی کدو ہی ہوتے ہیں۔ یہ دو قسم کے ہیں۔ دیسی اور ولایتی۔ ولایتی کا مطلب یہ نہیں۔ کہ وہ ولایت سے آتے ہیں۔ نہیں وہ ولایتی بن بیٹھتے ہیں۔ اس لئے لوگ بھی ولایتی کہہ دیتے ہیں۔ یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں۔ کہ دیسی کدوؤں سے ولایتی کدو زیادہ قدر و قیمت پاتے ہیں ؎

باغ دنیا میں اور بھی کئی قسم کے پھل پھول ہیں۔ ان کا بیان کرنا مضمون کو شاید غیر ضروری طوالت دینا ہوگا۔ ویسے بھی بھنگ کا نشہ کچھ اتر رہا ہے۔ اس لئے اب وہ عجیب و غریب درخت نظروں سے غائب ہو رہا ہے۔ ہاں ایک پھل کا ذکر ضروری ہے۔ وہ سب سے نکما۔ سب سے بدشکل اور کڑوا پھل ہے اس مضمون کا مصنف ؎

بھونرا کیا کہتا ہے؟

مسٹر اڈیٹر ——— آپ کو خط کیا لکھوں۔ لکھنا چاہتا ہوں۔ تو کئی ایک دشمن "تنگ کرنے لگ جاتے ہیں۔ میں آج کل جس جھونپڑی میں رہتا ہوں۔ اس کے نزدیک ہی میں بدقسمتی سے دو تین پھولوں کے درخت لگا چکا ہوں میرا خیال یہ تھا کہ چونکہ میرا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے جب یہ بڑے ہونگے تو میرے رفیق اور شفیق بنیں گے۔ نہ تو انہیں خوشامد کر کے پھلانے کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ ان کے لئے روپے خرچ کرنے کی۔ نہ ان کو کھلانا پڑے گا۔ نہ پہنانا۔ ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے چاپلوسی نہ کرنی پڑیگی اور یہ آپ سے آپ کھل اٹھا کریں گے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ مگر آنکھوں میں آنسو نہیں۔ سینے میں محبت ہے۔ مگر دل میں سختی نہیں۔ مجھے سب چھوڑ جائیں۔ اور دودھ دہی کھلانے والی شیاما گوالن بھی چھوڑ جائے مگر مجھے پروا نہ ہوگی۔ کیونکہ میرے معصوم اور دلکش دوست ——— پھول تو میرے پاس ہیں ؎

خیر پھول کھلے اور مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی۔ میں نے سوچا ——— آہ ابھی سوچنے پایا ہی نہ تھا۔ کہ بھونروں نے میرے دروازے پر حملہ کر دیا۔ ان کو شہد کی خواہش تھی۔ اور وہ میرے پھولوں میں تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا

نہ تاؤ۔ میرے جھونپڑے کے دروازے پر آ کر ڈٹ گئے۔ اور بھوں بھوں بھر بھوں بھر بھوں کر کے میرا جی جلانے اور تپانے لگے۔ میں نے ان کو سمجھایا اور کہا۔ "دوستو! یہ سبھا ہے نہ سماج، ایسوسی ایشن ہے نہ لیگ، کلب ہے نہ سوسائٹی، یہ تو ایک غریب کی جھونپڑی ہے۔ اسے چھوڑیئے اور بھوں بھوں بھر بھوں بھر بھوں کرنے کے لئے کوئی اور جگہ انتخاب فرمایئے۔" مگر میری عرضداشت بہرے کانوں میں پڑی۔ اور اس پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ پھولوں کو چھوڑ کر وہ میرے سر پر منڈلانے لگے۔ ابھی ابھی جب میں نے آپ کو خط لکھنا شروع کیا۔ تو ایک کاجل کا سا کالا افضلی بھونرا میرے پاس آیا۔ اور کان کے نزدیک ہو کر اپنا شام کلیان گانے لگا۔ اب کہئے اور انصاف سے کہئے۔ کہ خط کس طرح لکھوں؟

معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ بھونرا اپنے آپ کو بڑا فصیح لکچرار سمجھتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ میں اس کی بھوں بھوں سے خوش ہوں گا۔ مگر میرے ہی پھولوں کو توڑنا۔ اور پھر میری ہی جھونپڑی کے پاس آکر شور مچانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ غصے سے میں لال پیلا ہو گیا۔ اور بھونرے سے لڑنے کیلئے تیار ہو گیا۔ تاڑ کا پنکھا تھا۔ اسے ہی پکڑ لیا۔ اور خوب زور زور سے گھمانے لگا۔ بھونرا بھی بہادر تھا۔ مقابلے میں ڈٹ گیا اور دھواں دھار لڑائی شروع ہوئی۔ مگر آہ بدقسمتی تجھے کیا کہا جائے۔ تیری طفیل ماما کے میدان میں ہینبل کو بلٹوا کے میدان میں چارلس کو اور واٹرلو کے میدان میں نیپولین بوناپارٹ کو شکست ملی اور آج تیرے ہی باعث غریب براہمن کو ندامت ہوئی۔ وہ کبھی کپڑے میں چھپ جاتا۔ کبھی بغل میں۔ کبھی دھوتی میں۔ اور کبھی کبھی لمبے لمبے خوبصورت بالوں ہی میں گھر گیا۔ اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ مگر بھونرے نے

میرا پیچھا نہ چھوڑا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ میں زمین پر گر گیا۔ اُف میرے قلم کا ڈنکا دنیا میں بجے۔ اور میں غریب بھونرے سے شکست کھاؤں۔ افسوس!! افسوس!!! مٹی جھاڑتا ہُوا۔ کپڑے ٹھیک کرتا ہُوا میں زمین سے اٹھا۔ اور بھونرے سے معذرت کرنے لگا۔ اپنے سہنسر نام پاٹھ سے خوش ہو کر بھونرا میرے سامنے بیٹھ گیا اور کچھ کہنے لگا۔ میں نے غور سے سننا شروع کیا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اسکی زبان میں سمجھ سکتا ہوں۔ بھونرے نے کہا :۔

"براہمن دیوتا! یہ غصہ میرے اوپر ہی کیوں ہے؟ کیا محض میں ہی بھوں بھوں بھر بھوں کرتا ہوں؟ تمہارے ہندوستان میں پیدا ہو کر میں بھوں بھوں نہ کروں تو کیا کروں؟ کونسا ہندوستانی ہے۔ جو بھن بھن نہیں کرتا۔ اور کونسا ہندوستانی ہے۔ جسے بھر بھوں کے سوا دوسرا کوئی روزگار آتا ہے۔ راجے اور آنریبل کونسلوں میں بیٹھ کر بھر بھوں بھر بھوں کرتے ہیں۔ اور جو رائے بہادری اور دوسرے خطابوں کے امیدوار ہیں۔ وہ تو دن رات بھر بھوں ہی میں گذار دیتے ہیں۔ نوکری کے خواہشمند اتنا بھر بھوں کرتے ہیں کہ بس پرماتما یاد آجاتا ہے۔ تھوڑی سی انگریزی پڑھی۔ اور درخواست لے کر جگہ بہ جگہ دربدر اپنا مالکونس سنانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے۔ سوتے جاگتے یہی فکر اور یہی ذکر۔ پہلے۔ دوسرے۔ تیسرے۔ چوتھے پھر یہی سوال اور یہی خیال۔ بعض آدمی ایسے ہیں جو آزاد وکیل بن بیٹھتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے۔ کہ سچ جھوٹ کے گنگا ساگر میں اشنان کر کے صبح کو گھر سے نکلتے ہیں اور جب کچہری میں پہنچ کر جج۔ سب جج۔ ڈپٹی۔ کلکٹر۔ منصف کو دیکھتے ہیں۔ تو وہیں اپنا راگ چھیڑ دیتے ہیں۔ بعض آدمی حب الوطنی کے جوش میں بہہ جاتے ہیں۔ تو چند لڑکے بالوں کو اکٹھا کر کے میر کے آگے کھڑے ہو کر بھنبھنانا شروع کر دیتے

ہیں۔ ایک جگہ مل کر بیٹھتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ بھائی نوکری نہیں ملتی۔ آؤ بھر بھوں بھر بھوں کریں۔ سنتے نہیں ہو۔ فلاں رئیس کی لڑکی مرگئی ہے۔ آؤ ذرا بھر بھر بھن بھن کر چھوڑیں۔ فلاں آدمی لائق تھا۔ اب مرگیا ہے۔ آؤ بھر بھن بھوں بھوں سے اس کی یادگار قایم کریں۔ بعض آدمی اس پر بھی قانع نہیں ہیں وہ کاغذ قلم لیکر ہر ہفتے ہر روز ہر ماہ بھن بھوں ہی کرتے ہیں اور تم بھیا تم جو خط لکھنے لگے ہو۔ یہ کیا ہے؟ یہ بھی تو بھوں بھوں اور بھن بھن ہی ہے جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ تمہیں ایڈیٹر صاحب کچھ بھنگ بھجوا دیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہیں ہمارا بھنبھنانا اتنا بُرا کیوں لگتا ہے۔

"میں سچی کہنے سے نہیں رُک سکتا۔ تم لوگوں کا بھنبھنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میری طرف دیکھو۔ میں ایک معمولی کیڑا ہوں۔ مگر میں بھی صرف بھر بھوں بھر بھوں کرکے نہیں رہ جاتا۔ میں شہد اکٹھا کرتا ہوں۔ اور چھتا باندھتا ہوں۔ ساتھیوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ تم لوگ نہ شہد اکٹھا کرنا جانتے ہو۔ نہ چھتا باندھنا ہاں جانتے ہو۔ بھوں بھوں بھن بھن کرنا۔ تمہیں کوئی کام کرنے کا سلیقہ نہیں اور نہ کرنا چاہتے ہو۔ عورتیں رونا جانتی ہیں۔ آنسواں۔ کے پلکوں پر بستے ہیں۔ اور تم بھنبھنانا جانتے ہو"

"بک بک کرنا چھوڑو۔ اور عملی کام کرو۔ کام میں دل لگاؤ۔ تاکہ تمہاری طرف بھی لکشمی دیوی کی نظر ہو۔ اور تمہارے ہاں بھی دولت ہو۔ شہد جمع کرنا سیکھو۔ اور ہم سے اتفاق کا سبق لو۔ تمہاری زبان اور قلم سے تو شہد کی مکھی کا ڈنک ہی اچھا ہے۔ جس سے لوگ ڈرتے تو ہیں۔ سورگ میں اندر کا بجر ہے۔ زمین پر انگریز کی توپ اور ہوا میں ہماری بہنوں کا ڈنگ۔ مطلب یہ ہے کہ شہد جمع کرو۔ اور کام کرنا سیکھو۔ اور اگر دیکھو۔ کہ ہاتھ اور زبان میں اتنی سختی ہوتی ہے

کہ کام ہونا مشکل ہے۔ تو زبان کاٹ ڈالو۔ اور پھر کام کرو۔ دیکھو دل لگتا ہے کہ نہیں"۔

لکچر ختم ہو گیا اور لکچرار بھن بھن کر کے اڑ گیا۔ میں نے سوچا۔ یہ ضرور کوئی پنڈت ہوگا۔ کہتے ہیں۔ کہ جس شخص کے زیادہ ہاتھ پاؤں ہوں۔ وہ دوسروں سے بہت زیادہ لایق ہوتا ہے۔ ہمارے پاؤں ہیں دو دو اور اس کے ہیں چھ۔ پھر کون ہے۔ جو اسے پنڈت جی مہاراج نہ کہے گا۔ اگر یہ پنڈت مہاراج نہ ہوتا۔ تو اسے پرماتما چھ پاؤں کیوں دیتا۔ اچھا تو یہ ہوا۔ پنڈت اور پنڈت بھی معمولی نہیں بلکہ بڑا بھاری۔ اس لئے اس کی رائے کو فضول نہیں سمجھنا چاہئے۔ لہٰذا میں آج اپنا بھر بھوں بھن بھن بھر بھوں والا خط ختم کرتا ہوں۔ اور اخبار (پھول) سے بھنگ (شہد) حاصل کرنے کی امید رکھتا ہوا رخصت ہوتا ہوں ۔
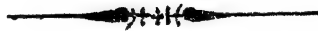
عورتوں کا حُسن

بہت سی عورتیں اپنے حُسن کے غرور میں زمین پر پاؤں نہیں رکھتیں۔ سمجھتی ہیں۔ کہ جدھر جھک کر نکل جائیں گی۔ اسی طرف ان کے نور حُسن کی موجوں میں لوگوں کے ہوش وحواس ڈوب جائیں گے۔

وہ خیال کرتی ہیں۔ کہ ان کے حُسن کی آندھی جس طرف جاتی ہے۔ اسی طرف سب لوگوں کے صبر کے چھپر اڑ جاتے ہیں۔ ایمان کے مکانات گر جاتے ہیں۔ جس وقت ان کے بحرِ حُسن کی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس وقت مردوں کے افعال کے جہاز۔ ان کے ایمان کی کشتی۔ عقل کی ڈونگی غرقاب ہو جاتی ہے لطف تو یہ ہے کہ یہ خیال صرف عورتوں ہی کا نہیں۔ جو نشۂ حُسن میں پھولی نہیں سماتیں۔ بلکہ مرد بھی جس وقت عورتوں کی خوبصورتی پر ریجھ کر محو ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی تعریف شروع کرتے ہیں۔ اس وقت ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں۔ کہ سُن کر اچنبھا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ لوگ عورتوں سے تشبیہ دینے کے لئے آسمان کے نورانی اجرام اور زمین کے پہاڑوں، چرندوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں اور درختوں میں کشمکش پیدا کر دیتے اور ان کو ذلیل کرواتے ہیں۔ کسی حسینہ کے چہرے کی تشبیہ کے لئے ماہ کامل کو مدعو کرتے ہیں پھر یہ کہہ کر کہ اس کے منہ میں سیاہ جھائیاں ہیں۔ اسے واپس کر دیتے

ہیں۔ غریب چاند اپنی بدنامی سے کر رات بھر تو اپنا کام کرتا ہے۔ مگر صبح ہوتے ہی بھاگ جاتا ہے۔

کسی جمیلہ خوب رُو کی پیشانی پر سیندور کا ٹیکا دیکھ کر کہتے ہیں۔ کہ اس میں نکلتے ہوئے سُورج سے زیادہ رونق ہے۔ سُورج دیوتا غصہ ہو کر زمین کو جلاتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ کسی پری چہرہ۔ نازک لب کی ہنسی دیکھ کر ان کو کھلے ہوئے کنول پر سورج کی کرنوں کی چمک یا شگفتہ نیلوفر پر چاند کی شعاعوں کا ناچ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی وجہ سے کنول اور نیلوفر کیڑے مکوڑوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔

کسی حسینہ کے گلے کا ہار دیکھ کر آسمان کے تارے ان کی نگاہوں میں نہیں جچتے۔ کیا تعجب ہے۔ کہ لوگ علم نجوم چھوڑ کر ستاروں کا کام سیکھنے لگیں۔ وہ لوگ حسینان خوش اندام کے جسم کی جنبش دیکھ کر چاندنی رات میں نرم نرم پتوں کا مزے سے ہلنا۔ یا سمندر کی لہروں پر چاند کی کرنوں کا کھیلنا پسند نہیں کرتے۔ اور جب وہ کسی پری پیکر کی آنکھیں دیکھ لیتے ہیں۔ تو دکن کی ہوا سے ہلتے ہوئے گل نیلوفر پر کیا منحصر ہے، دنیا کی ساری چیزیں ان کی نظروں سے گر جاتی ہیں۔

بہر حال ان زن پرستوں میں تشبیہ دینے کی جو قابلیت ہے۔ اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ اگر آنکھ دیکھ لی۔ تو پرندوں میں کھنجن اور چکور سور یا ئی جانوروں میں گرئی اور بھور مچھلی۔ نباتات میں کنول اور نیلوفر بے جان اشیاء میں آسمان کے تاروں سے تشبیہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ چاند کو کبھی چہرے سے۔ کبھی پاؤں کے ناخن سے ملاتے ہیں۔ سینے کے لئے کبھی آسمان کی چوٹی۔ کبھی کنول کے اندرونی حصے کا ذکر ہے۔ جب اس سے بھی سیری

نہیں ہوتی۔ توانار۔ قدم کا پھل۔ ہاتھی کے مستک کو تشبیہ کے لئے گھسیٹتے ہیں۔ چال کی تعریف میں دریا کے ہنس اور زمین کے ہاتھی سے مشابہت دیتے ہیں۔ ان کو ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ دونوں کی رفتار عورتوں کی چال ڈھال سے مشابہ سمجھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ایسے ویسے ہاتھی سے سروکار نہیں۔ بلکہ جو ہاتھی سب ہاتھیوں کا راجہ ہو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ہاتھی میں سبک خرامی اور ڈیل ڈول کو سنبھال کے چلنے کے علاوہ تیز رفتاری بھی تو ہے۔ وہ ایک دن میں جتنی دور جا سکتا ہے۔ گھوڑا یا اور کوئی جانور نہیں جا سکتا پس جس کو دور دراز مقام تک جانا ہو۔ وہ ایسی عورت کی پیٹھ پر کیوں نہیں سوار ہو لیتا۔ جو ہاتھی کی سی چال چلتی ہے۔ کیا خوب ہے کہ جس طرف ریل نہیں ہے۔ اس طرف چُن چُن کر ایسی عورتوں کی ڈاک بٹھا دی جائے۔

میں بھی ایک زمانے میں عورتوں کے حُسن پر مفتون ہو کر ایسے شاعروں کے گروہ میں شامل تھا۔ مجھے بھی ساری دنیا میں عورتوں سے زیادہ کوئی چیز بھلی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چمپا۔ کنول۔ گلاب کسی پھول کی خوبصورتی عورتوں کے حُسن کے سامنے کچھ نہ تھی۔ حسینہ گل اندام کے روبرو پھولوں سے بھرا ہؤا باغیچہ ماند تھا۔ مگر اب وہ خیالات مٹ گئے۔ اب مجھے ہوش آگیا۔ عورتوں نے مردوں کے پھانسنے کے لئے جو جال بچھا رکھا ہے میں اس کو توڑ کر بھاگ نکلا۔ مچھلی پکڑنے کے جال سے جس طرح کوئی بڑی مچھلی جال توڑ کر نکل جاتی ہے۔ مکڑی کے جال سے جس طرح کوئی بڑا کیڑا نکل جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی نکل آیا۔ جس طرح کوئی زوردار شریر جانور رسیاں توڑ کر بھاگتا ہے۔ اسی طرح میں جی توڑ کر بھاگا۔ یہ سب افیون کھانے کا پھل ہے۔ اے افیون

کی دیوی تمہاری ڈبیا سلامت رہے۔ تم ہر سال سونے کے جہاز پر چڑھ کر ملک چین میں پوجا کی چیزیں کھانے جاؤ۔ جاپان۔ سائبیریا، یورپ، امریکہ، ہر ملک میں تمہارا راج پاٹ ہو۔ مجھے اپنے قدموں سے الگ نہ کرنا۔ تمہاری عنایت سے میں اس وقت دو چار باتیں اور لوگوں کی بھلائی کے لیئے بیان کروں گا۔ میری باتیں سُن کر عورتیں تو عورتیں بہت سے مرد بھی مجھے پاگل کہیں گے۔ کہنے دو۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جو نئی بات کہتا ہے۔ اسی کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔ گلیلیو نے کہا۔ زمین گھومتی ہے۔ یہ سُن کر اٹلی کے علماء و شرفا ہنس دیئے۔ اپنے دلوں میں سمجھے۔ کہ گلیلیو عقل سے معذور ہو گیا۔ زمانہ گذرتا گیا۔ اب اٹلی کے علماء و شرفا زمین کو گھومتا ہوا سُن کر نہیں ہنستے۔ گلیلیو کو اب پاگل نہیں سمجھتے۔

ہر شخص کا خیال ہے۔ کہ حُسن میں درجہ اعلیٰ عورتوں کو حاصل ہے۔ علم عقل اور قوت میں مردوں کو فضیلت دیتے ہیں۔ مگر حُسن کا سہرا عورتوں ہی کے سر رہتا ہے۔

میرے نزدیک یہ عین خطا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ کہ بہ نسبت عورتوں کے مردوں میں حُسن کہیں زیادہ ہے۔ اے حُسن کی متوالی عورتو۔ اپنی خشم آلود نگاہوں سے زہر برسا کر مجھے ہلاک نہ کرنا۔ اپنے سانپ کو شرمانے والی چوٹی سے باندھ کر مجھے قید نہ کرنا۔ اپنے ابروؤں کی کمان سے نکیلے تیر چلا کر میری جان نہ لینا۔ بات یہ ہے کہ تمہاری بُرائی کرتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ موقع پا کر اگر تم اپنی نتھ کا حلقہ پھیلا دو۔ تو بڑے بڑے ہاتھی پھنس کر جھولنے لگیں۔ میں بے چارہ کس قطار میں ہوں۔ اگر تمہاری نتھ کا لٹکن گر پڑے۔ تو بہت سے مردوں کا خون ہو سکتا ہے اگر تمہارے چندار

کا ایک چاند ٹوٹ کر کسی مرد پر گر پڑے۔ تو اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتے ہیں۔ خدا کے لئے تم مجھ پر غصہ نہ کرنا۔ اور اے عورتوں کے عاشق تشبیہوں کے دل دادہ شاعر! تم بھی اس خیال سے میری جان نہ مارنا کہ میں تمہاری پرستش کرنے کی مورت کو توڑنے والا ہوں۔ میں ثابت کردوں گا۔ کہ تم لوگ بے جا طور پر بت پرست ہو۔ تم شاہد حقیقی کو چھوڑ کر ایک ذلیل مورت کی پوجا کرتے ہو۔ جس کے بال خود ہی خوشنما ہیں۔ وہ مصنوعی بال استعمال نہیں کرتا۔ جس کے صاف شفاف دانت یوں ہی موجود ہیں۔ وہ بنے ہوئے دانت نہیں لگاتا۔ جس کے چہرے کا رنگ یوں ہی نظر فریب ہے۔ اس کو پوڈر سے چہرہ کی چمک بڑھانے کی حاجت نہیں۔ جس کو خدا نے صحیح و سلامت آنکھیں دی ہیں۔ وہ عینک کی مدد نہیں لیتا۔ جس کے پاؤں ہیں سوہ کاٹھ کے پاؤں استعمال نہیں کرتا۔ اسی طور سے جس کے پاس جو چیز موجود ہوتی ہے وہ اس کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ ہاں جو یہ سمجھتا ہے۔ کہ قدرت نے اس کو کسی عمدہ چیز سے محروم کیا ہے۔ وہی کمی کے پورا کرنے کی فکر کرتا ہے یہی باتیں دیکھ سن کر میں نے یہ رائے قائم کی ہے۔ کہ عورتوں میں حسن بہت کم ہے وہ ہمیشہ اپنی خوبصورتی بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ ہمیشہ اسی خیال میں محو ہیں۔ کہ کسی ترکیب سے اپنا جوبن دکھلائیں۔ ہمیشہ یہی فکر اور یہی کوشش ہے۔ کہ کہیں عمدہ عمدہ زیور کی چیزیں ہاتھ لگیں۔ زیور ہی ان کے لئے دیوتا ہے۔ زیور ہی کا دھیان ہے۔ زیور ہی کی ہر وقت دُھن ہے۔ جس کو اپنے بناؤ سنگار کی اتنی فکر ہو اس کو ہرگز قدرتی طور پر حسین نہیں خیال کر سکتے۔ جس کی ناک خوبصورت نہیں۔ وہی نتھ کے حلقہ میں شکن کے چلنا تھر کو جھلاتی ہے۔ جس کے کان اچھے نہیں۔

وہی ڈھاکے کے بنے ہوئے جھمکے کرن پھول وغیرہ کانوں میں لٹکائے پھرتی ہے جس کا سینہ ابھرا ہؤا نہیں ہے۔ وہی بچلڑی کی رتیاں گلے میں ڈالتی ہے۔ جو بغیر زیور کے اپنے تئیں حسینہ سمجھے گی۔ وہ اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے کیوں راضی ہو گی۔ مرد کو زیور کی پروا نہیں۔ مگر عورتیں بغیر زیور کے انسانوں کے مجمع میں منہ دکھاتے ہوئے شرماتی ہیں۔ پس خود انہیں کی حرکتوں سے معلوم ہو گیا۔ کہ بہ نسبت ان کے مردوں میں حُسن زیادہ ہے قدرت کو اگر غور سے دیکھئے۔ تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے۔ جس چاند کو دیکھ کر قوس قزح شرمائے۔ اس طرح کے بہت سے چاند مور کے پروں میں ہیں کہ مورنی میں۔ جن ایال سے شیر کی رونق ہے۔ وہ شیرنی میں نہیں۔ جو جوبن سانڈ کے جسم میں ہے۔ گائے میں کہاں۔ مرغ کے تاج میں جو حُسن ہے مرغی میں نہیں۔ اسی طور پر دیکھنے سے معلوم ہؤا۔ کہ جتنے اعلےٰ درجے کے جانور ہیں۔ سب میں بہ نسبت مادہ کے نر زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ امر قابل یقین نہیں۔ کہ پروردگار عالم نے انسانوں میں اس قاعدے کو اُلٹ دیا ہو۔ بدّیا سندر ایک قصہ ہے۔ جس میں عورت کا نام بدّیا اور مرد کا نام سندر رکھا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کیا اسی وجہ سے تم نے عاشق کا نام سُندر رکھا تھا۔ کیا تم نے بھی سمجھ لیا تھا۔ کہ عورت کیسی ہی لائق کیوں نہ ہو۔ مگر حُسن اور عقل میں مرد کے سامنے ہار ہی مان جائے گی حسن کی بہار جوانی بھر ہے۔ مگر اے جوبن کی متوالیو۔ تمہارا جوبن کتنے دنوں رہتا ہے۔ سمندر کے جوار بھاٹے کی طرح آتے ہی آتے چلا جاتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں تمہارا جسم ڈھیلا ڈھالا ہو جاتا ہے۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر تک جو حالت مردوں کی رہتی ہے۔ وہ حالت تمہاری

بیس پچیس برس کی عمر تک بھی نہیں رہتی۔ تمہارے حُسن کو ایسا ہی قیام ہے۔ جیسے بجلی یا قوسِ قزح کو۔ بس تھوڑی دیر میں کچھ نہ تھا۔ جو عورتوں کے حُسن پر مفتون ہیں۔ مجھے ان کی تکلیفوں کا خیال اس وقت آتا ہے۔ جب میں کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہوں۔ مجھے اس بات کی بڑی تکلیف رہتی ہے۔ کہ کھانا پتے پر ڈالتے ہی ڈالتے ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ عورتوں کا جوبن بھی موٹے چاولوں کا بھات ہے۔ محبت کے پتے پر آتے ہی آتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے، پھر بھلا اس کو کون کھا سکتا ہے۔ بعد کو ہونا یہ ہے۔ کہ بناؤ سنگار کی چٹنی میں خاطرداری کا نمک ڈالتے ہیں۔ اور اس کے سہارے سے تھوڑا بہت نگل لیتے ہیں۔ اے حُسن پر مغرور عورتو۔ سچ کہنا۔ کیا تمہارے حُسن کی اسی وجہ سے اتنی خاطر ہوتی ہے۔ کہ اس کو زیادہ قیام نہیں۔ کیا مرد اسی لئے تمہارے حُسن پر مفتون ہوجاتے ہیں۔ کہ ان کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں دیکھتے ہی دیکھتے غایب نہ ہوجائے۔ کیا تمہارا جوبن اسی لئے تھا۔ کہ وہ اس طور پر چل دیتا ہے۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ صرف یہی بات نہیں۔ بلکہ اور بھی وجوہ ہیں۔ جن سے عورتوں کا حُسن مرغوب ہوگیا۔ جن لائق لوگوں کا کلام مقبول عوام ہوا ہے۔ وہ سب مرد تھے۔ اس لئے انہوں نے عورتوں کی تعریف کرنے میں اپنی ذاتی محبت کو بھی صرف کیا۔ جب محبت ہوئی۔ تو اس میں اچھے بُرے کی تمیز کہاں۔ وہ اپنی آنکھوں میں محبت کا سرمہ لگا کر عورتوں کو دیکھتے تھے۔ پھر بھلا بہ نسبت مردوں کے عورتوں کو حسین کیوں نہ خیال کرتے۔

اے محبت کے دیوتا۔ مغربی شاعروں نے تم کو اندھا بیان کیا ہے، یہ بات جھوٹ نہیں۔ تمہاری بدولت جو جس کو چاہتا ہے اس میں کوئی عیب

نہیں دیکھتا۔ بدنما سی بدنما عورت بھی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ دلخراش آواز میں شیرینی پیدا ہوتی ہے۔ ہوا میں خوشنما بیلوں کے آہستہ آہستہ ہلنے سے زیادہ کسی چڑیل کے جسم کی جنبش بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے ملک چین میں چپٹی ناک پسند ہے۔ اسی لئے ولایت میں رنگین بال اور بلی کی سی آنکھیں مرغوب ہیں۔ اسی لئے ملک حبش میں موٹے ہونٹوں کی قدر ہے۔ اسی لئے بنگالے میں جسم پر کالے گودنے اور دانتوں میں کالی مِسّی کی خاطر ہے۔ اسی لئے مردوں میں عورتوں کا حُسن مطبُوع ہے۔ گو عورتیں اپنے خیالات اور دلی جذبات کو زبان پر لانے میں بہت کچھ پس و پیش کرتی ہیں تب بھی ان کے افعال سے ان کا دلی منشا ظاہر ہوجاتا ہے۔

اکثر لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ کہ عورتیں ایک دوسرے کی تعریف نہیں کرتیں مگر مردوں کی تعریف کبھی کبھی ان کے منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔ اس سے کیا یہ مترشح نہیں ہوتا۔ کہ دل ہی دل میں وہ مردانہ حُسن کی معترف ضرور ہیں۔ حُسن حُسن کی پکار نے عورتوں کو تباہ کر دیا۔ سب یہی سمجھنے لگیں۔ کہ ان کا جو کچھ سرمایہ ہے۔ حُسن ہی ہے۔ اور ان کے پاس سوائے حُسن کے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے عورتیں جس چیز کی خواہش کرتی ہیں۔ مرد اُس شے کو حُسن ہی کے عوض میں دینا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے انسانوں میں کسبیوں کا گروہ پیدا ہوگیا۔ اسی وجہ سے بیچاری گھر گرستیوں کو غلامی نصیب ہوئی۔

عورتوں میں جو کچھ قوت ہے وہ حُسن کی۔ دنیا کے سمندر سے پار ہونے کے لئے عورتوں کے لئے حُسن ہی ان کا جہاز ہے۔ میں ایسی باتیں سننا نہیں چاہتا۔ بہت دنوں سُن چکا۔ سنتے سنتے کان پھر گئے۔ زیادہ نہیں سکتا۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ عورتوں میں حُسن سے سو گنی۔ ہزار گنی لاکھ گنی خوبیاں

خوش اطواری کی ہیں۔ میں سننا چاہتا ہوں۔ کہ وہ صبر وعفت اور محبت کی مورتیں ہیں۔ جن لوگوں نے دیکھا ہے۔ کہ عورتیں کسی اپنے عزیز کی علالت میں کس کس طرح پر خدمت اور تیمارداری کرتی ہیں۔ ان کو عورتوں کے صبر و استقلال دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جن لوگوں نے دیکھا ہے۔ کہ عورتیں اپنے شوہر یا لڑکے کے لئے جان دے دیتی ہیں، ایمان اور عصمت کی خاطر سے ساری دُنیا پر لات مار دیتی ہیں۔ وہ کچھ کچھ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ کہ عورتوں کے دل میں محبت اور ایمان داری کہاں تک ہے۔ جس وقت میں اعلےٰ درجہ کی عورتوں کا خیال کرتا ہوں۔ اس وقت میری نظر کے سامنے ستی کے جان دینے کا سماں پھر جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ نعشیں جلانے کے لئے لکڑیاں جل رہی ہیں۔ جلتی ہوئی آگ میں ستی اپنے شوہر کے قدموں کو گود میں لئے ہوئے بیٹھی ہے۔ آگ رفتہ رفتہ پھیلتی جاتی ہے۔ جسم کے ایک حصہ کو جلا کر دوسرے حصے میں لگا لگاتی ہے۔ مگر وہ ستی اپنے شوہر کے جلے ہوئے قدموں کا خیال دل سے دور نہیں کرتی۔ کبھی کبھی ہر ہی بول زبان سے نکالتی ہے۔ یا آسمان کی طرف آنکھ اٹھاتی ہے۔ اپنی جسمانی تکلیف کو کسی طور پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ چہرے پر برابر بحالی موجود ہے۔ رفتہ رفتہ آگ کے شعلے اور بھڑکے۔ اس ستی نے جان گنوائی۔ اور جسم راکھ ہو گیا۔ واہ رے صبر، واہ ری محبت، واہ رے ایمان +
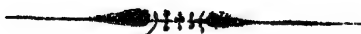
قانون تعزیراتِ شادی

ہم عورتیں ہیں۔ ہمیں سیدھا سادا سمجھ کر مرد ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ لیکن شاید یہ امر انہیں معلوم نہیں۔ کہ نئی تہذیب و تعلیم کی بدولت ہماری آنکھیں بھی کھل گئی ہیں۔ اور ہمیں پتہ لگ گیا ہے۔ کہ مرد ہماری طرف سے کس قدر بے پروا ہو رہے ہیں۔ کسی وقت ہماری آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ زمانہ جہالت تھا۔ لیکن اب ہوا کا رُخ تبدیل ہو گیا ہے۔ ہم صاف صاف دیکھ رہی ہیں۔ کہ خاوند اپنی بیویوں کے احکام کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اُن کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیں اندیشہ ہے۔ کہ اگر ہم اِس وقت خاموش رہیں۔ تو ہماری دنیا میں مرد ہم سے بغاوت کریں گے۔ لہٰذا ہم نے ایک سوسائٹی بنائی ہے۔ جس کا کام عورتوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہو گا اس سوسائٹی کا نام "عورت سبھا" تجویز کیا گیا ہے ہم نے اس سبھا کے قواعد و مقاصد گورنمنٹ کے پاس بھی بھیجے ہیں۔ ساتھ ہی تعزیرات شادی کا مسودہ پریس میں رائے زنی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔

سب کے حقوق کی حفاظت کے لئے قوانین وضع کئے جا رہے ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ ہم عورتوں کے لئے قوانین نہ بنائے جائیں۔ اس لئے یہ مسودہ بہت جلد پاس ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے شوہر اکثر اُردو نہیں

جانتے۔ یا کم از کم کہتے ہیں۔ کہ ہم ہندوستانی نہیں جانتے۔ اس لئے یہ مسودہ زبان انگریزی میں تیار کیا گیا تھا۔ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ ترجمہ انگریزی کے مطابق ہوگا۔ اگر دونوں زبانوں میں کچھ فرق ہو۔ تو انگریزی کا مسودہ قابل اعتبار ہے ؞

پہلا باب

دیباچہ

چونکہ عورتوں کے سرکش شوہروں اور دیگر مردوں پر (جو عورتوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتے) حکومت کرنے کے لئے خاص قانون کی ضرورت ہے، اس لئے حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے ؞

دفعہ ۱۔ اس قانون کا نام "قانون تعزیرات شادی" ہوگا۔ ہندوستان میں جتنے دیسی شادی شدہ مرد ہیں۔ ان سب پر اس کا اطلاق ہوگا ؞

دوسرا باب

تعریفیں

دفعہ ۲۔ شوہر عورت کی مرضی پر چل سکنے اور چلنے والی شے کا نام ہے۔ جو اس کے قبضہ میں ہو ؞

مثال

(الف) ٹرنک اور صندوق شوہر نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ گو ان پر عورت کا قبضہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ چل پھر نہیں سکتے ؞

(ب) بچھڑے۔ بیل۔ گائے وغیرہ بھی شوہر نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ چل پھر

تو سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں۔ کہ عورت کی مرضی پر ہی حرکت کریں۔ وہ کبھی کبھی خود بھی حرکت کر لیتے ہیں۔

(ج) صرف مرد ہی جو شادی کے بعد اپنی مرضی کو بیوی کے دوپٹے کی آنچل میں باندھ دیتے ہیں۔ شوہر کہلانے کے مستحق ہیں۔

دفعہ ۳۔ بیوی اس عورت کا نام ہے۔ جو اپنے خاوند اور اس کی جائداد پر قابض ہو۔

تشریح

جائداد کے قبضہ میں مارنے پیٹنے کا حق بھی شامل ہے۔

دفعہ ۴۔ گذشتہ جنم کے گناہوں کی پاداش میں مرد جس حالت میں بخوشی داخل ہو جاتا ہے۔ اُسے شادی کہتے ہیں۔

تیسرا باب

تعزیرات

دفعہ ۵۔ اس قانون کے مطابق مجرموں کو مندرجہ ذیل سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

اوّل قید جو خوابگاہ کے اندر بھی ہو سکتی ہے۔ اور کسی مکان کی چار دیواری کے اندر بھی۔

قید دو قسم کی ہے (الف) سخت۔ سخت الفاظ کے ساتھ (ب) محض جس میں بیوی کا کڑکنا شامل نہیں۔

دوسرے۔ جلاوطنی۔ یعنی کمرے سے باہر نکال دینا۔

تیسرے۔ عورت کی غلامی۔

چوتھے۔جرمانہ۔پاکٹ خرچ کی ضبطی۔
دفعہ ۶۔اس قانون میں سزائے موت کا یہ مطلب ہے۔کہ بیوی لڑکر کسی سہیلی کے گھر یا میکے چلی جائے۔اور جلد واپس ہونے پر رضامند نہ ہو۔
دفعہ ۷۔معمولی قصوروں پر مفصلہ ذیل سزائیں دی جائیں گی۔
(الف) بولنا بند کر دینا (ب) گرجنا۔(ج) بیوی کا خاموشی سے رونا یا بلند آواز سے چیخیں مارنا۔(د) بیوی کا خاوند کی بےعزتی کرنا۔

چوتھا باب

مستثنیات

دفعہ ۸۔کوئی فعل جو بیوی سے سرزد ہو۔جرم نہیں کہلا سکتا۔
دفعہ ۹۔کوئی فعل جو خاوند بیوی کے کہنے پر کرے۔جرم نہیں کہا جا سکتا۔
دفعہ ۱۰۔کوئی شادی شدہ شخص اس قانون کی دفعات سے مستثنےٰ نہیں سمجھا جائے گا۔

پانچواں باب

اعانت جرم

دفعہ ۱۱۔ وہ مرد اس قانون کی رو سے مجرم ہوگا اور سزا کا مستوجب ہوگا جو:۔
(الف) کسی مرد کو اس قسم کا جرم کرنے کی ترغیب دے یا صلاح مشورہ دے۔
(ب) یا اس قسم کا جرم کرنے کے وقت اس کے ساتھ شامل ہو۔

تشریح

غیر شادی شدہ مرد یا عورت دونو اس قانون کی رُو سے اعانت جرم کے مجرم ہو سکتے ہیں ❊

مثال

(الف) سوہن پاربتی کا شوہر ہے۔ موہن ایک غیر شادی شدہ شخص ہے اگر موہن سوہن کے ساتھ بیٹھ کر شراب پئے۔ تو قانون تعزیرات شادی کی روسے یہ تسلیم کیا جائے گا۔ کہ موہن نے سوہن کو جرم کرنے میں امداد دی۔ کیونکہ شراب پینا قانون تعزیرات شادی کے بموجب جرم ہے ❊

(ب) کشوری رام لال کی ماں ہے۔ رام لال کامنی کا شوہر ہے۔ کامنی جس طرح روپیہ صرف کرنا چاہتی ہے۔ اس کی مخالفت کرکے رام لال نے اپنی ماں کشوری کے مشورہ سے اس روپیہ کو دیگر طریقہ سے خرچ کیا۔ اب قانون شادی کے مطابق بیوی کی مرضی کے خلاف عمل کرنا جرم ہے۔ اس لئے کشوری اعانت جرم کی مجرم ہے ❊

دفعہ ۱۲۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت مرد کی امداد کرے یا اسے ترغیب دے، تو وہ دونو ایک ہی سزا کے مستوجب ہوں گے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان کے مقدمات کی سماعت با اختیار عدالت میں کی جائے ❊

تشریح

اس جگہ با اختیار عدالت سے مراد اس عورت سے ہے۔ جس کے خاوند سے جرم سرزد ہوا ہو ❊

دفعہ ۱۳۔ جرم کی اعانت کرنے والی عورتیں اور غیر شادی شدہ مرد محض بے عزتی، طعنے بازی گالی اور آنسو بہانے کی سزا کے مستوجب

ہوں گے۔

چھٹا باب

حکومت کے خلاف جرائم

دفعہ ۱۴۔ اس قانون میں سٹیٹ (حکومت) لفظ کے معنی "شادی شدہ حالت" کے ہوں گے۔

دفعہ ۱۵۔ جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ فساد کرے۔ یا فساد کرنے کی کوشش کرے۔ یا فساد کرنے میں امداد دے۔ اس کی بیوی اُسے پھانسی دیدیگی۔ یعنی اس کو اپنے کمرے سے نکال کر اس کا جیب خرچ بند کردے گی۔

دفعہ ۱۶۔ اگر کوئی شخص دوستوں کو بلا کر بچوں کو اپنی طرف کر کے، فساد کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے دوسرے کمرے میں قید کر دیا جائے گا۔ اور اسے چیخنے چلانے اور آنسو بہانے کے ذریعہ سے سزا دی جائے گی۔

دفعہ ۱۷۔ اگر کوئی شخص اپنی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت پر عاشق ہو گا۔ تو وہ بدمعاشی کے جرم کا مجرم قرار دیا جائے گا۔

تشریح

کسی نوجوان عورت کے ساتھ جو اپنی عورت نہ ہو۔ ذرا سی مہربانی کا سلوک روا رکھنا بھی بدمعاش ہونا ہے۔

مثال

زید زکیہ کا خاوند ہے۔ اور نفیسہ ایک اور نوجوان عورت ہے۔ زید نفیسہ

کے لڑکے کو پیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خوبصورت ہے۔ اِس کا مطلب یہ لیا جائیگا کہ زید نقیبہ پر عاشق ہے۔

تشریح

(الف) عورتوں کو کامل اختیارات حاصل ہوں گے۔ کہ وہ اپنے خاوندوں کے مقدمات کی اس جرم میں سماعت کریں۔ کوئی خاوند محض اس وجہ سے بری نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے یہ جرم نہیں کیا۔ استغاثہ بذات خود جرم کا ثبوت تسلیم کیا جائے گا۔

(ب) ایسے شوہر کے مقدمات کی سماعت کے اختیارات ان تمام بیویوں کو حاصل ہوں گے جن کے خاوند ضعیف اور بدصورت ہونگے۔ اور جو عورت نوجوان ہوگی۔ اسے یہ اختیارات اس وقت تک حاصل نہ ہوں گے۔ جب تک کہ وہ ثابت نہ کر دے۔ کہ وہ خاص طور پر بدمزاج یا نہایت ہی بدصورت عورت ہے۔

دفعہ ۱۸۔ جو اس (بدمعاشی کے) الزام میں ماخوذ ہوگا۔ اسے ہر قسم کی سزا دی جاسکے گی۔

ساتواں باب

بچہری اور بری سپاہ

دفعہ ۱۹۔ اس کوڈ میں بچہری اور بری سپاہ کے معنی لڑکے۔ لڑکی اور بہوئیں لئے جائیں گے۔

دفعہ ۲۰۔ جو شخص لڑکے لڑکی یا بہو کی امداد کر کے اہل خانہ کے خلاف بغاوت کرائیگا۔ اسے گستاخی اور رونے کے ذریعہ سزا دی جائے گی۔

آٹھواں باب

جرائم متعلقہ بدامنی

دفعہ ۲۱۔ دو یا دو سے زائد شوہروں کا یکجا جمع ہونا۔ مجمع خلاف قانون سمجھا جائیگا اگر ان کی نیت ہو کہ:۔

(الف) شراب پیئں۔ جوا کھیلیں یا کوئی اور جرم کریں۔

(ب) طاقت کی نمائش کر کے عورتوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کریں۔

(ج) ان کے احکام کے عملدرآمد میں خلل ڈالیں۔

دفعہ ۲۲۔ جو مرد مجمع خلاف قانون کا ممبر ہوگا۔ اسے قید سخت (سخت کے معنی یہاں عورت کے گرجنے کے ہیں) کی سزا دی جائے گی۔

نواں باب

شراب کے بارے میں

دفعہ ۲۳۔ کوئی بھی مائع شے جو بوتل میں رکھی جائے اور شیشہ کے گلاس میں پی جائے۔ شراب شمار ہوگی۔

دفعہ ۲۴۔ جس کے پاس شراب (جس کی تعریف اوپر کی جا چکی ہے) پائی جائیگی وہ شرابی سمجھا جائیگا۔

تشریح

ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی مرد ساری عمر میں شراب کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مگر اس کو بھی شراب پینے والا سمجھا جائے گا۔

دفعہ ۲۵- جس پر شراب پینے کا جرم ثابت ہو جائیگا۔ اسے خوابگاہ میں سرِ شام سے قید کر دیا جائے گا۔ اور اس کی بیوی سرد آہیں بھر کر اور گرم آنسو بہا کر اسے سزا دے گی ٭

دسواں باب

ڈاکہ زنی

دفعہ ۲۶- جو مرد اپنی بیوی سے ترش یا تلخ لہجہ میں بات چیت کریگا۔ اُسے گھر کے امن پر ڈاکہ زنی کا مرتکب سمجھا جائے گا ٭

دفعہ ۲۷- جو کوئی اپنے گھر کے امن پر ڈاکہ ڈالے گا۔ اسے سخت قسم کی سزا دی جائے گی ——— اس کی بیوی اس کے سامنے بیٹھ کر روئے گی۔ اور اسی وقت اسے روٹی کھانے پر مجبور کریگی ٭
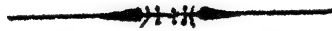
سالِ نَو

مختصر ناٹک

اشخاص ناٹک۔ شیام بابو۔ رام بابو اور اُسکی بیوی

(رام بابو اور شیام بابو کا داخلہ)

شیام۔ گڈ مارننگ۔ ہَوڈُو یہ ڈُو رام بابو ۔

رام۔ گڈ مارننگ۔ ہَوڈُو یہ ڈُو شیام بابو ۔

(پُرتپاک طریق سے مصافحہ کرتے ہیں)

رام۔ آئی وِش یُو اے ہیپی نیو ایر ۔

شیام۔ دی سیم ٹو یُو ۔

{تھوڑی دیر کے بعد کچھ بات چیت کر کے شیام بابو کا چلے جانا۔ رام بابو کا اُسے رخصت کر کے واپس آنا۔ اس کی بیوی کا پردے کی اوٹ سے نکلنا ۔}

بیوی۔ یہ کون تھا؟

رام۔ میرا ایک دوست شیام بابو ۔

---

۵۱ سلام مزاج شریف ۵۲ میری آرزو ہے کہ سالِ نو آپ کو مبارک ہو ۔

۵۳ اور آپ کو بھی ۔

بیوی۔ تو تم میں ہاتھا پائی کیوں ہوتی تھی؟
رام۔ ہاتھا پائی کب ہوئی ہے؟
بیوی۔ میں نے خود دیکھا تھا۔ کہ تم نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا تھا۔ اور اس نے بھی جواب میں تمہارے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا تھا۔ کہیں موچ تو نہیں آگئی؟
رام۔ اسے ہی تم ہاتھا پائی کہتی ہو۔ یہ محبت کی نشانی ہے۔ اور اسے انگریزی میں Shake hand. کہتے ہیں؟
بیوی۔ تو تب میری خوش نصیبی ہے۔ جو میں تمہاری پیاری بیوی نہیں ہوں۔ ورنہ آئے دن میرا ہاتھ مروڑتے رہتے۔ خیر تمہیں کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی؟
رام۔ معمولی سی ہوئی ہے۔ اس کا ذرا ناخن لگ گیا ہے مگر کچھ ہرج نہیں ہے؟
بیوی۔ ماس چھل گیا ہے۔ کمبخت۔ وحشی صبح سویرے ہی کیا یہاں مرنے آگیا تھا۔ اب پھر اُسے "ہاڈو ہاڈو" نہ کھیلنا۔ میری مانو تو اب اس سے بولنا ہی چھوڑ دو؟
رام۔ کھیل کب کھیلی ہے؟
بیوی۔ اس نے کہا ہاڈو ہاڈو۔ جواب میں تم نے بھی کہہ دیا۔ ہاڈو ہاڈو۔ یہ کھیل نہیں تو کیا تھی۔ دیکھو اب تم بڑے ہو۔ یہ عمر ہاڈو ہاڈو کھیلنے کی نہیں ہے۔ اب پھر نہ کھیلنا؟
رام۔ بڑی بے وقوف ہو۔ آخر گاؤں میں رہنے والی ٹھیری نہ؟
بیوی۔ لیکن یہ کیوں؟
رام۔ اس نے یہ ہاڈو ہاڈو نہیں کہا تھا۔
(سگرٹ سلگاتا ہے)

بیوی - تو کیا کہا تھا؟
رام - (سگرٹ کا کش لگا کر) ہوڈو - یوڈو ۔
بیوی - اس کے کیا معنی ۔
رام - معنی یہ کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟
بیوی - یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں ۔
رام - کیوں ؟
بیوی - اس لئے کہ اس نے پوچھا - آپ کا مزاج کیسا ہے - جواب میں تم نے ہوڈو یڈو کر دیا - کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ حالانکہ آپ کو جواب یہ دینا چاہیئے تھا - کہ اچھا ہوں ۔
رام - تم اگر لکھی پڑھی ہوتی - تو سمجھ سکتی - کہ آج کل کا یہی طریقہ ہے - یہ تہذیب کی نشانی ہے ۔
بیوی - بات کو دوہرا دینا ہی تہذیب کی نشانی ہے - میرا لڑکا اگر پڑھنے لکھنے میں غفلت کرے - اور تم اسے کہو - کہ اونالائق پڑھتا کیوں نہیں - تو کیا وہ یہی جواب دے دے - تو تہذیب والا سمجھا جائے گا ۔
رام - یہ بات نہیں - آپ کا مزاج کیسا ہے - صرف اس کے جواب میں آپ کا مزاج کیسا ہے - کہنا چاہیئے - انگریزی میں یہی طریق ہے (ٹہلتا ہے) سگرٹ پیتا ہے)
بیوی - (ہاتھ باندھ کر) میری ایک عرض ہے ۔
رام - کہو - کہو بات کیا ہے ؟
بیوی - تم روز بیمار رہتے ہو - میں دن میں پندرہ پندرہ دفعہ تمہارا حال پوچھتی ہوں - کہ طبیعت کیسی ہے - اب جب میں پوچھا کروں - تو ہڈو ہڈو

کر کے ٹال نہ دیا کرنا۔ میرے لئے تم مہذب نہ ہو تو اچھا ہے ؞
رام۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر تم کو یہ سب باتیں سمجھ لینا چاہیے ؞
بیوی۔ مشکل بڑا مشکل۔ لیکن یہ تو بتلائیے۔ کہ شیام بابو تمہارا دوست آیا۔ اور دو چار گِٹ مِٹ کر کے چلا گیا۔ اگر یہ کھیل نہیں تھی۔ تو اتنی جلدی کاہے کی تھی ؞
رام۔ آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔ اس لئے مبارک باد کہنے آیا تھا ؞
بیوی۔ آج نیا سال ہے۔ یہ کیسے؟ ہم لوگ تو چیت سے نیا سال مانتے ہیں ؞
رام۔ آج یکم جنوری ہے۔ آج سے ہی نیا سال شروع ہوتا ہے ؞
بیوی۔ ہمارے باپ دادا کا سال شروع ہوتا تھا۔ پہلی چیت سے تمہارا شروع ہوتا ہے۔ پہلی جنوری سے اور تمہارے لڑکے کا شروع ہوگا۔ پہلی ساون سے ؞
رام۔ بیوقوف ہوگئی ہے۔ راج انگریزوں کا ہے۔ ہمیں ان کے مطابق سال شروع کرنا چاہیئے ؞
بیوی۔ کیا یہ سرکار کا حکم ہے۔ کہ ضرور یکم جنوری ہی سے سال کرو ؞
رام۔ ہاں دفتروں میں یہی قاعدہ ہے ؞
بیوی۔ مگر گھروں میں تو نہیں ہے۔ تم دفتر میں جا کر سمجھ لینا۔ کہ آج سال شروع ہؤا ہے۔ مگر گھر کو بھی دفتر کیوں بناتے ہو۔ یہ تو سرکار کا حکم نہیں ہے ؞
رام۔ (کھسیانہ ہو کر) ضرور ہے ؞
بیوی۔ مگر میں تو ہمیشہ پہلی چیت سے سال گنتی ہوں۔ سرکار نے مجھے تو کبھی

نہیں پکڑ لیا۔ خیر اسے جانے دو۔ اب یہ بتاؤ۔ کہ یہ شراب کی بوتلیں کیوں منگوائی ہیں ؃

رام۔ خوشی کا دن ہے۔ چار دوست مل کر جلسہ کریں گے ؃

بیوی۔ جلسہ کرو گے اور کرو گے شراب پی کر۔ اس کے بغیر رنگ نہیں جمتا ؃

رام۔ بے ہودہ ؃

بیوی۔ واقعی اِس میں کیا شبہ ہے۔ اس لئے تو مجھے کچھ اور سوال کرتے خوف آتا ہے ؃

رام۔ اب اور کیا پوچھتی ہو؟

بیوی۔ پوچھتی یہ ہوں۔ کہ یہ سب گوبھی۔ شلغم۔ گاجر۔ انار۔ پستہ انگور مچھلی وغیرہ اتنا کچھ کیوں منگوایا ہے۔ کیا سب کچھ چار ہی دوست مل کر کھا جاؤ گے؟

رام۔ نہیں یہ چیزیں صاحب لوگوں کو ڈالی دینے کے لئے منگوائی ہیں ؃

بیوی۔ رام رام یہ نہ کرنا۔ لوگ بدنامی کریں گے ؃

رام۔ کیا کہیں گے ؃

بیوی۔ کہیں گے کہ یہ لوگ باپ کے شرادھ میں مچھلی اور شراب کھلاتے ہیں ؃

رام۔ ہٹ ؃

{بیوی کا ڈر کر بھاگنا رام بابو کا حیران ہونا۔ اور وکیل کے پاس جا کر پوچھنا کہ ہندو خاوند بیوی کو طلاق دے سکتا ہے یا نہیں ؃}
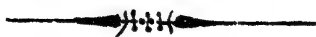
انگریزی لٹریچر کا مدّاح

ہندوستانی بیوی بیٹھی ایک ہندی کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کہ صاحب نما شوہر نے آکر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟

بیوی نے جواب دیا ذرا ایک کتاب دیکھ رہی ہوں "

شوہر "کونسی کتاب"؟

بیوی۔ ہندی کی ہے۔ میں تمہاری طرح انگریزی تو جانتی نہیں۔ ہندی میں جو کچھ ملتا ہے۔ پڑھ لیتی ہوں ٭

شوہر۔ واہیات! اس سے تو نہ پڑھنا ہی اچھا ہے ٭

بیوی۔ لیکن کیوں؟ آپ ہندی کے اِتنے برخلاف کیوں ہیں؟

شوہر۔ اس میں سب کچھ **Immoral, obscene, filthy.** ہوتا ہے ٭

بیوی۔ اس کے کیا معنی؟

شوہر۔ **Immoral.** نہیں جانتی۔ جو **Morality.** کے خلاف ہو ٭

بیوی۔ یہ کسی جانور کا نام ہے۔ کیا؟

شوہر۔ نہیں نہیں اس کے مانک ہندی لفظ کہاں سے لاؤں ۔ جو

جو بات Moral. نہ ہو۔ وہ بات ہمیشہ Immoral. کہلاتی ہے ۔

بیوی۔ مرال تو ہنس کو کہتے ہیں ۔
شوہر۔ گڈ گاڈ۔ آخر عورت ذات ٹھہری۔ تم کیا سمجھ سکتی ہو

O woman, thy name is stupidity.

بیوی۔ اس کے کیا معنی ہیں ۔
شوہر۔ ہندی میں اتنے لمبے فقرے کا مطلب سمجھانا تو بہت Difficult. ہے مطلب یہ کہ ہندی کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں ۔
بیوی۔ لیکن کتاب تو نہایت عمدہ ہے ۔
شوہر۔ ایک راجہ کی دو عورتیں تھیں۔ ایک کے ساتھ اس کی محبت تھی۔ دوسری کے ساتھ نہیں۔ بس یہی کچھ ہو گا۔ اور کیا۔ یا نل دمن کی کہانی ہو گی ۔
بیوی۔ اس کے سوا اور ہندی میں کچھ ہے ہی نہیں کیا؟
شوہر۔ بالکل نہیں ۔
بیوی۔ آپ غلطی پر ہیں۔ اس میں کٹیلٹ ہے۔ برانڈی ہے۔ بیواؤں کی شادی ہے۔ ایک سادھو کا گیت ہے ۔
شوہر۔ Just so, اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ کہ ان کتابوں کو نہ پڑھا کرو ۔
بیوی۔ لیکن کیوں ۔
شوہر۔ آدمی Demoralize. اس سے ہو جاتا ہے ۔
بیوی۔ یہ کیا۔ ڈوم راجہ ہو جاتا ہے؟

شوہر۔ یہ ایک قسم کا گناہ ہے۔ میرے خیال میں **Demoralize.** کو شاید
چال چلن خراب ہونا کہتے ہیں ٭
بیوی۔ مہاراج! آپ برانڈی کی بوتلیں چڑھا جاتے ہیں۔ جن کا چہرہ دیکھنے
سے بھی پاپ لگتا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ آپ کے
یار دوست میز پر بیٹھ کر جس قسم کی بے ہودہ باتیں کرتے ہیں۔ انہیں
سن کر خانساماں بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ آپ جن کے
گھر جا کر مرغی اور بھیڑ کے مانس کا شرادھ کرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر
کے گناہوں میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ اس سے چال
چلن خراب نہیں ہوتا۔ مگر میرے اس کتاب پڑھنے سے ڈوم راجہ
ہو جاتا ہے ٭
شوہر۔ ہم لوگ **Brass pot.** ہیں۔ تم **Earthen pot.**
بیوی۔ پھر وہی دوہ شروع ہوا۔ لو ذرا اس کتاب کو پڑھ کر تو دیکھو۔
شوہر۔ (دو قدم پیچھے ہٹ کر) مہربانی کر کے اسے ہٹا لو میں اُسے چھو نہیں
سکتا **contaminate.** hand ہو جائے گا ٭
بیوی۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟
شوہر۔ مطلب یہ کہ ہاتھ خراب ہو جائے گا ٭
بیوی (کتاب کو اپنے آنچل سے صاف کر کے دیتی ہے) لو دیکھو
(خاوند کتاب کو زمین پر پھینک دیتا ہے)
بیوی۔ ہائے ری قسمت! تم جس کتاب کو اتنی نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے
ہو۔ اس کی تو انگریز بھی تعریف کرتے ہیں۔ سُنا ہے اس کتاب کا ترجمہ
انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ اسے بڑے شوق

سے پڑھتے ہیں۔

شوہر۔ بے وقوف ہو گئی ہو

بیوی۔ کیا وجہ؟

شوہر۔ ہندی کی کتاب کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اس پر کوئی اعتبار نہیں کر سکتا۔ کہیں یہ کتاب .Seditious تو نہیں۔ اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ کہ گورنمنٹ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں .Translation کرایا ہو۔ اس کا نام کیا ہے؟

بیوی۔ وش برکش۔

خاوند۔ کیا مطلب۔ معنی سمجھاؤ۔ میں کچھ نہیں سمجھتا۔

بیوی۔ وش کے معنی بھی نہیں جانتے۔ زہر کا درخت۔

خاوند۔ بیش۔ یعنی دس جمع دس بیس۔

بیوی۔ وہ نہیں۔ جو چیز میں تم سے لڑ کر کھانے کو تیار ہو جاتی ہوں وہ

خاوند۔ .Poison, dear me اس کا درخت۔ دیکھو میرا کہنا مانو۔ اور اس کتاب کو پھینک دو۔ بڑا خوفناک نام ہے۔

بیوی۔ درخت کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

خاوند۔ Tree

بیوی۔ اب دونو لفظوں کو ملا کر بولو۔ کیا نام بنا!

خاوند۔ .Poison Tree اچھا! یہ وہ کتاب ہے۔ میں نے اس کا ذکر کسی میگزین میں پڑھا ہے۔ کیا وہ اس کتاب کا ترجمہ ہے۔

بیوی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

خاوند۔ میرا خیال تھا کہ یہ کتاب اس کا ترجمہ ہو گی۔ خیر جب یہ کتاب انگریزی

میں ملتی ہے۔ تو ہندی میں پڑھنے سے کیا فایدہ*
بیوی۔ تو صرف انگریزی کتاب پڑھنی چاہئیے۔ خواہ وہ کسی کی لکھی ہوئی ہو
بہت اچھا تو دیکھو۔ یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہے*
شوہر۔ تب ضرور پڑھنی چاہئیے۔ کس کتاب کا ترجمہ ہے:۔

Wait on the improve کا یا Robinson Crusoe.
کا ment of the mind.

بیوی۔ انگریزی نام تو پتہ نہیں کیا ہے۔ ہندی نام چھایا مئی ہے*
شوہر۔ چھایا مئی لاؤ تو دیکھوں کیا ہے (دیکھ کر) ہیں؟

Dante by jove.

بیوی۔ انگریزی کا ترجمہ میں دیہاتن کیا سمجھوں گی؟ اگر ہو سکے تو تم سمجھا دو۔ سمجھا سکو گے؟

شوہر۔ Dante lived in the fourteenth century.
دے Flourish. میں fourteenth century. کرتے تھے*

بیوی۔ کیا کیا؟ ———— سندری کو پالش کرتے تھے۔ وہ کیا شاعر تھا*
شوہر۔ Fourteenth کے معنی چودہ*
بیوی۔ یعنی اس نے چودہ سندریوں (خوبصورت عورتوں) پر پالش کیا۔ خیر اب سوال یہ ہے۔ کہ عورتوں پر پالش کیسے کیا جا سکتا ہے*
شوہر۔ بے وقوف اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ چودھویں Century. میں Florance. نام کے ایک شہر میں رہتا تھا*

بیوی۔ تم کتاب ہاتھ میں لو۔ پھر بات کرنا*

شوہر۔ پہلے آتھر کا لائف جاننا ضروری ہے۔ اس نے بڑے بڑے اونچے درجے کے Appointments held کئے تھے*

بیوی۔ پورٹ منٹو پر ہلدی لگایا کرتے تھے۔ مگر ہماری پورٹ منٹو تو کالی ہے اس پر ہلدی کا رنگ نہیں چڑھ سکتا*

شوہر۔ یہ مطلب نہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر کام کیا تھا*

بیوی۔ تم مجھے کتاب کا مطلب سمجھاؤ*

شوہر۔ لاؤ (پہلی سطر پڑھتا ہے)

ہوئی سانجھ گھر گئی گگن میں اندھیاری

تمہارے پاس ڈکشنری ہے؟

بیوی۔ کیوں؟ کس لفظ کے معنی نہیں جانتے؟

شوہر۔ گگن کسے کہتے ہیں؟

بیوی۔ آسمان کو*

شوہر۔ اور بھارتی کے کیا معنی ہیں*

بیوی۔ رام رام! نہیں یہ بھی معلوم نہیں۔ تو تم مجھے سمجھاؤ گے خاک بھاری یعنی بہت "زیادہ" یہی تمہاری لیاقت ہے*

شوہر۔ یہ سب چھوٹے درجہ کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ہمارا اس سے کوئی فایدہ نہیں*

بیوی۔ ہمارا کس کا؟

شوہر۔ یعنی Polished society میں رہنے والوں کا

بیوی۔ مگر یہ پالشڈ سوسٹی ہماری مادری زبان پر اتنی ناراض کیوں ہے؟

شوہر۔ ماں تو کب کی مرچکی ہے۔ اب اس کی زبان سے کیا تعلق ؛
بیوی۔ میری تو یہی زبان ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی ؛
شوہر۔ **Yes, for thy sake. my jewel.** میں اِسے پڑھوں گا۔ مگر ایک سے زیادہ نہ پڑھوں گا ؛
بیوی۔ اچھا! مجھے منظور ہے ؛
شوہر۔ مگر مکان کے دروازے بند کرکے پڑھوں گا۔ تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کیوں ؟
بیوی۔ جیسی تمہاری مرضی ؛

{بیوی ایک نہایت بیہودہ کتاب شوہر کو دیتی ہے۔ شوہر اسے تمام وکمال پڑھ لیتا ہے ؛}

بیوی۔ کیوں ؟ کیسی کتاب ہے ؟
شوہر۔ بہت اچھی ہے۔ مجھے بالکل خیال نہ تھا۔ کہ ہندی میں ایسی اچھی کتاب بھی موجود ہے ؛
بیوی۔ واہ وا۔ یہی تمہاری پالش سوسٹی ہے۔ اس سے تو میری بغیر پالش کے سوسٹی لاکھ درجہ بہتر ہے ؛
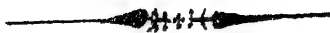
پالٹیکس

(اڈیٹر کے نام خط)

بخدمت شریف ——— بھنگ ملی مشکور ہوں۔ براہ نوازش کچھ اور بھی بھیج دیجئے گا ۔

مگر معلوم نہیں۔ آپ نے ایسا سخت حکم کیوں بھیجا ہے۔ کہ میرے بدن میں لرزہ آ رہا ہے۔ آپ نے تحریر کیا ہے۔ کہ اس وقت لوگ پالٹیکس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون پر کچھ لکھوں۔ لوگ قدردانی کریں گے۔ مگر جناب من! یہ تو فرمائیے۔ کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ جس کی پاداش میں مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے ——— پالٹیکس کے سنگ گراں کے ساتھ سر پھوڑنے کا حکم جاری ہُوا ہے۔ میں معمولی عقل کا آدمی ہوں۔ ایسے سنجیدہ امور پر کیا لکھ سکوں گا۔ پتہ نہیں آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ جو یہ حکم دیا ہے۔ میں کیا ساجہ ہوں۔ یا خوشامدی محاسب ہوں۔ یا جوار یا چور ہوں۔ یا آزاد منش فقیر ہوں۔ یا بڑا بھاری اہل دماغ ہوں۔ جو پالٹیکس پر لکھ سکوں گا۔ آپ لکھتے ہیں کہ تم نے بھنگ کے لئے خوشامد کی ہے۔ کی ہو گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ میں پالٹیکس پر بھی لکھ سکوں گا۔ نہ بابا یہ راستہ بڑا دشوار

گذار ہے۔ یہاں قدم قدم پر پھسلن ہے۔ اور کیا آپ نے مجھے اتنا ذلیل سمجھ لیا ہے۔ کہ میں شاعری کی بلند پروازیاں ترک کر کے پالٹیکس کے قعرِ مذلت میں گرنا قبول کرونگا ؟

میں نے بھنگ کا گولہ حلق سے نیچے اتارا اور دیکھا تو سامنے گلو تیلی کا گھر تھا۔ اس کے آنگن میں دو تین بیل بندھے ہوئے تھے۔ اور مٹی میں گڑی ہوئی ناند میں تیلن کی ہاتھ کی ملائی ہوئی کھلی کو مزے سے آنکھیں بند کر کے کھا رہے تھے۔ میری طبیعت ٹھکانے ہوئی۔ یہاں تو پالٹیکس نہیں۔ کیا مزے سے کھا رہے ہیں۔ اور کوئی فکر نہیں۔ کہ ہم کو پالٹیکس پر کچھ لکھنا ہے ———— طبیعت ٹھکانے ہوئی۔
یکایک یاد آیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

گونگا چاہے بولوں فر فر لنگڑا چاہے چلنا خُوب
تم چاہو ہو جاؤں عالم۔ خواہش ہی تو ہے کیا خُوب

ہم لوگوں کی خواہش پالٹیکس ہے۔ ہم ہر روز، ہر ہفتہ، ہر شام کو پالٹیکس پر لکچر چاہتے ہیں۔ ہر صبح پالٹیکس پر مضمون کے خواہاں ہیں لیکن یہ خواہش پوری کیسے ہو؟ جس طرح گونگے کے بولنے کی خواہش، لنگڑے کے دوڑنے کی خواہش، اندھے کے دیکھنے کی خواہش، ہندو بیوہ کی محبّت کی خواہش مضحکہ خیز ہے۔ اسی طرح یہ خواہش بھی مضحکہ خیز ہے۔ نہ وہ پوری ہو سکتی ہے۔ نہ یہ بر آ سکتی ہے۔ اڈیٹر صاحب! میں آپ کے فائدے کی بات کہتا ہوں۔ آپ اس ارادہ سے باز آئیں۔ پانی کی جڑیں ہو سکتی ہیں۔ ریت کو پھول لگ سکتے ہیں۔ لیکن جس قوم نے اپنی پھوٹ کے باعث غیروں کو اپنے مُلک میں مدعو کیا ہو۔ اور اپنی قسمت ان کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ اسے

پالٹیکس سے واقفیت ہونا ممکن نہیں۔ ان کا پالٹیکس بھیک مانگنا ہے۔
"بھگوان بھلا کرے۔ کچھ کھانے کو دو۔" ان کی سیاست اسی فقرے میں
مضمر ہے۔ اس کے سوا اور پالٹیکس جس درخت میں لگتا ہے۔ وہ ہندوستان
کی سرزمین میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں ان خیالات میں محو تھا۔ اتنے میں دیکھا۔ کہ گلو تیلی کا دس برس کا
پوتا ایک تھالی میں روٹی لا کر چھپر کے نیچے بیٹھ کر کھانے لگا۔ ذرا فاصلے پر
ایک کتا تھا۔ وہ نزدیک آ گیا۔ اور دم ہلا کر زبان باہر نکال کر بچے کی
طرف دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھوکا تھا ــــــــ اس کا
پیٹ پیٹھ کے ساتھ لگ گیا تھا۔ اس نے جب بچے کو روٹی کھاتے
دیکھا۔ تو اس کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے اپنا جسم پورے طور پر توڑ کر
جمائی لی۔

اس کے بعد کچھ سوچ سمجھ کر اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک پیر اٹھا
کر آگے رکھنا شروع کیا۔ گویا زبان حال سے کہنے لگا کہ کچھ مجھے بھی دو۔
یکایک میری آنکھوں کے آگے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ خیال آیا یہی تو
پالٹیکس ہے ــــــ یہی کتا تو پالیٹشن (مدبر) ہے۔ میں بغور دیکھنے
لگا۔ کتے نے مضبوط پولٹیکل چال چلنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا۔ تیلی
کا لڑکا سیدھا سادا ہے۔ مارتا نہیں۔ وہ اور آگے بڑھا۔ لڑکا پھر بھی کھاتا
رہا۔ کتا اور آگے ہوا۔ یہاں تک کہ بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ اور
پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ لڑکا پھر بھی کھانے میں لگا رہا۔ کتے نے آہستہ
آہستہ دم ہلانا اور پیار بھری نرم آوازیں ہاؤ ہاؤ کرنا شروع کیا۔
اس کا دبلا پتلا جسم بھوکا پیٹ خشک نگاہ اور باہر نکلی ہوئی زبان

دیکھ کر تیلی کے لڑکے کو اس پر رحم آگیا کتے کی پولٹیکل ایجی ٹیشن کا نتیجہ نکل آیا ------ تیلی کے لڑکے نے اس کے سامنے ہڈی پھینک دی۔ کتا اچھل کر آگے بڑھا۔ اور ہڈی کو منہ کے بل لیٹ کر کھانے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھیں مسرت سے بند ہو رہی تھیں ؛

جب کتا اس ہڈی کا رس بخوبی لے چکا۔ تو اس مدبر نے سوچا کہ ایک ہڈی اور لینا چاہئے۔ اس پر اس نے اس لڑکے کی طرف پھر انہی بھیک مانگنے والی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن لڑکے کا خیال اس طرف نہ ہوا۔ وہ اپنی روٹی گوشت کے ساتھ ملا ملا کر بدستور کھاتا رہا۔ کتے نے بہادری کا راستہ اختیار کیا اور ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ پالٹیکس اسی کا نام ہے۔ لڑکے کی توجہ کتے کی طرف ہو گئی۔ کتے نے پھر جمائی لی۔ لیکن لڑکے پر اثر نہ ہوا۔ کتا غرانے لگا۔ شاید اس کا یہ مطلب تھا کہ "اے تیلی کے لڑکے! تو کھا رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کچھ مجھے بھی دے"۔ تیلی کے لڑکے نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ اور ایک روٹی کا ٹکڑا اس کے سامنے پھینک دیا۔ مہاراج اندر جس شان سے اندر پوری میں حکومت کرتے ہیں۔ کارڈینل اولسی یا کارڈینل جیبرج نے جس شان سے کارڈینل کی ٹوپی پہنی تھی۔ کتا بھی اسی شان سے روٹی کا ٹکڑا کھانے لگا ؛

ادھر تیلی کی جورو باہر نکلی۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ اس کے بیٹے کے پاس کتا روٹی کھا رہا ہے۔ تو اس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اس نے ایک بھاری سی اینٹ اٹھا کر کتے کو زور سے مارا۔ پالیٹیشن کتا چوٹ کھا کر، دم دبا کر طرح طرح کے راگ گاتا ہوا وہاں سے بھاگ

نکلا ـــــــــــ سلامتی اسی میں تھی ؎

دوسری طرف ایک اور واقعہ ہوُا۔ جب ادھر کتّا اپنے پیٹ کو بھرنے کی فکر میں مصروف تھا۔ ادھر دوسری طرف ایک موٹا بیل آ کر تیلی کے ناند میں منہ ڈال کر کھلی کھانے لگا۔ تیلی کا بیل کمزور تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کتّے کو مار کر تیلن ادھر بوٹی۔ تو یہ لوٹ مچ رہی تھی۔ اس نے ایک لاٹھی اٹھائی۔ اور حملہ آور بیل کو موت کا مشورہ دیتے ہوئے اس کی جانب بڑھی ؎

لیکن یہ سانڈ بڑا زبردست تھا۔ وہ ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا۔ جب تیلی کی جورو اس کے عین سر پر پہنچ گئی۔ تو اس نے اپنے لمبے لمبے سینگ ہلا کر تیلن کے پیٹ میں گھونپنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تیلن ڈر کر اندر بھاگ گئی۔ بیل نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور ناک منہ صاف کر کے جھومتا جھامتا اپنے راستے لگا ؎

مجھے خیال آیا۔ یہ بھی پالٹیکس ہے۔ تیلی کے آنگن میں میں نے پالٹیکس کے دو نظارے دیکھے۔ ایک کتّے کا پالٹیکس۔ دوسرا بیل کا پالٹیکس بسمارک اور گر تکف بیل کے پالٹیکس کے پیرو ہیں۔ اور راوسی سے لیکر میرے دوست رائے بہادر ڈھول پرشاد تک دوسری جماعت کے پالٹیشن (مدبر) ہیں ؎

پروانہ

رات کا وقت تھا۔ میں اپنے ایک دوست رسک بابو کی بیٹھک میں بیٹھا لیمپ کی روشنی کو گھور رہا تھا۔ رسک بابو ہندوستانیوں کی پھوٹ پر رو رہے تھے۔ اور میں عقلمند مدبر کے مانند ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے میں مصروف تھا۔

اتنے میں دیکھا کہ ایک پروانہ آکر لیمپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ اور اپنا الگوزہ سنانے لگا۔ مجھے خیال آیا۔ کہ اگر میں اس پروانہ کی زبان سمجھ سکتا۔ تو کیا ہی خوب ہوتا۔ کان کو لگا کر سنا۔ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا۔ میں نے آزردہ ہو کر کہا۔ تو کیا راگ گا رہا ہے۔ مجھے تو ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آتا۔ اتنے میں دماغ کے دروازے کھل گئے۔ جس طرح ناٹک میں یکایک پردہ اٹھ جاتا ہے۔ اور سجا ہوا دربار دیکھ کر تماشبین تالیاں بجانے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح میرے سامنے پروانہ کی زبان روشن ہو گئی۔ پروانے نے مجھ سے کہا۔ میں اس روشنی کے ساتھ بات چیت کر رہا ہوں۔ تو دخل در معقولات نہ کر خاموشی سے سن"

میں نے زبان کو روک لیا اور سننے لگا۔ پروانہ لیمپ سے بولا "سنو بی روشنی! تم پہلے تو اچھی تھیں۔ اس وقت پیتل کی ڈیوٹ پر مٹی کے

دئے ہیں تمہارے حُسن کے جلووں کی بجلی کوندا کرتی تھی۔ اور ہم بغیر رکاوٹ کے تم پر مرا کرتے تھے۔ مگر اب ہوا کا رُخ کیا بدلا۔ تم نے بھی فیشن قبول کر لیا۔ اور شیشہ کے گھر کے اندر پردہ نشین بن بیٹھیں۔ اب ہم آتے ہیں۔ چاروں طرف پھرتے ہیں۔ مگر تم تک پہنچنے کی کوئی راہ ہی نہیں ملتی"

"دیکھو یہ مرنا ہمارا حق ہے۔ رائٹ ہے' ہمارا خاندان تم پر سے ہمیشہ قربان ہوتا آیا ہے۔ مگر اب نئی روشنی کا زمانہ کیا آیا' ہمارا حق بھی چھن گیا ——— اب مرنے کی بھی اجازت نہیں ملتی۔ آج تک ہم کو کسی نے مرنے سے نہیں روکا تھا' تیل کی روشنی' موم بتی کی روشنی' لکڑی کی روشنی۔ کاغذ کی روشنی کسی نے ہم سے پردہ نہیں کیا۔ پھر تم نے کیوں یہ پردہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ ذرا خیال کرو' ہم غریب پروانے۔ ہم کو کیوں نہیں مرنے دیا جاتا۔ ہم ہندوؤں کی عورتیں نہیں' کہ جل کر مر نہ سکیں گی"

"ہم میں اور ہندوؤں کی عورتوں میں بہت فرق ہے۔ وہ جب تک امید' بھروسہ' سہارا رہتا ہے۔ تب تک موت کے نزدیک نہیں آتیں۔ وہ پہلے بیوہ ہوتی ہیں۔ بعد میں ستی۔ مگر ہماری طرف نگاہ کرو۔ ہمیشہ جلنے کو آمادہ ہیں' ہمارے ایثار کے ساتھ عورتوں کے ایثار کا مقابلہ کیسا؟

"یہ درست ہے۔ کہ ہماری مانند عورتیں بھی حُسن کی آگ دیکھ کر کود پڑتی ہیں۔ اور نتیجہ بھی یکساں ہوتا ہے ——— وہ بھی مر جاتی ہیں' ہم بھی جل مرتے ہیں۔ مگر ان کو تو اس جلنے میں راحت ہے۔ ہم کو کیا فایدہ

ہوتا ہے۔ ہم محض مرنے کی خاطر جلتے ہیں۔ کیا عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں؟ اگر نہیں تو شاعروں کو منع کرو۔ کہ وہ ان کا مقابلہ ہمارے ساتھ نہ کیا کریں ۔

"میرا تو یہ خیال ہے۔ کہ اگر حُسن کی شعلہ بار آگ میں اس جسم کی آہوتی نہ دے دی جائے۔ تو آدمی کا جسم پانا ہی بے کار ہے۔ پتہ نہیں دوسرے جانداروں کی کیا رائے ہے، لیکن ہم غریب پروانے ہیں۔ ہم کو تو تحقیقات کرنے کے باوجود معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اس جسم کا حقیقی مصرف کیا ہے۔ ہم اسے کیا کریں۔ ہم ہمیشہ پھولوں کا شہد پیتے ہیں۔ سورج کی نرم اور گرم کرنوں پر رقص کرتے ہیں۔ لیکن طبیعت میں مسرت نہیں آتی۔ پھولوں میں وہی بُو ہے۔ شہد میں وہی حلاوت ہے۔ سُورج کی کرنوں میں وہی گرمی ہے۔ ایسی ناپائدار قدیم طرز کی بوسیدہ دنیا میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اے خوبصورتی کی مورت باہر آ۔ ہم جل کر مر جائیں گے [1]

میں تم سے ایک معمولی بھیک مانگتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میں تمہاری نذر کرنے کے لئے اپنا متاعِ جان لایا ہوں۔ اسے قبول کرو۔ میں تم سے یہی مانگتا ہوں۔ بتلاؤ اس میں تمہارا ضرر کیا ہے۔ تمہاری پیدائش کی غرض صرف جلانا ہے۔ اور میری جلنا۔ جب میں جلنے کو تیار ہوں تو تم جلاتے کیوں نہیں۔ تاکہ میں جل کر راکھ کی چٹکی میں تبدیل ہوجاؤں ۔

---

[1] مصنف نے یہاں اُن آدمیوں پر مذاق اڑایا ہے۔ جو ہندوستان کی پرانی تہذیب کو وحشیوں کی تہذیب کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرف تم جا رہے ہو اُدھر اوّل اوّل چمک ہے۔ مگر انجام کار جلن اور موت ۔

"تم میں دنیا بھر کو جلا ڈالنے کی طاقت ہے۔ تلسی داس تمہاری مایا کا معترف تھا۔ تبھی تو اُس نے کہا تھا:۔

کاہ نہیں پاوک میں جرے کال کاہ نہیں کھائے

"کونسی زندگی ہے۔ جسے موت نہیں آتی۔ اور کونسی شے ہے۔ جسے آگ کی شعلہ بار قوت بھسم نہیں کر دیتی۔ پھر تم اس کانچ کے برقعہ کے اندر کیوں چھپی ہوئی ہو۔ جب دنیا کی حرکت محض تمہارے باعث جاری ہے۔ تو تم اسیری کے صدمے کیوں جھیل رہی ہو۔ مجھ سے کہو کس جاہل نے تمہارے لئے یہ کال کوٹھڑی تیار کی ہے۔ اور کس ظالم نے تمہیں اس کے اندر بند کر رکھا ہے۔ اے دنیائے حُسن کی ملکہ! تو دنیا کے ذرّے ذرّے میں ملی ہوئی ہے۔ پھر مجھے کھلے درشن کیوں نہیں دیتی؟

"تم کیا ہو؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ تاہم یہ میں ضرور جانتا ہوں۔ کہ تم میرے لئے ہو۔ میری بیداری کا نغمہ، نیند کا خواب، زندگی کی امید اور موت کا بھروسہ ہو۔ تم کیا ہو؟ اس کا مجھے پتہ لگا ہے نہ لگ سکیگا۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ جس دن تمہاری ماہیت سمجھ جاؤں گا۔ اسی دن میری مسرت مٹی میں مل کر برباد ہو جائے گی۔ کیونکہ جس شے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی اصلیت کا علم ہو جائے۔ تو اس کا جادو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس جادو کے ساتھ ہی اس کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔

"اے نور کی ملکہ! کیا تم مجھے نہ ملو گی؟ کیا تم ہمیشہ اس کانچ کے برقعہ ہی میں چھپی رہو گی؟ اور کیا تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ میں اسے پھاڑ نہ سکونگا؟ اگر تمہارا درحقیقت یہی خیال ہے۔ تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ ذرا ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر پروانہ اڑ گیا +

اتنے میں رسک بابو نے مجھے آواز دی۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ رسک بابو کی جگہ ایک موٹا مسٹنڈا پروانہ تکیہ کے سہارا بیٹھا ہُوا حقہ پی رہا ہے۔ وہ مجھ سے بھر بھوں بھوں کر کے گفتگو کرنے لگا۔ میں حیران رہ گیا اور سمجھ نہ سکا کہ رسک بابو پروانہ کیسے بن گئے۔ لیکن دوسرے لمحہ میں معلوم ہُوا کہ دنیا کا ہر ایک آدمی پروانہ ہے۔ اور ہر ایک کے جلنے کے لیئے کوئی نہ کوئی آگ موجود ہے۔ سبھی کو یقین واثق ہے۔ کہ اس آگ میں جل مرنے کا انہیں حق حاصل ہے۔ ان میں سے کوئی جل کر مر جاتا ہے۔ کوئی شیشے کی دیوار سے ٹکریں مار کر لوٹ جاتا ہے۔ یہ آگ کئی قسم کی ہے ستم کی آگ، روپے کی آگ، شہرت کی آگ، حُسن کی آگ، مذہب کی آگ، کہاں تک شمار کریں۔ تمام کائنات آگ سے بھرا ہُوا ہے۔ اور اس آگ کے گرد چمنی بھی ہے۔ جو لوگ آگ پر قربان ہوتے ہیں۔ وہ آگ تک پہنچ نہیں سکتے۔ ٹکریں مار کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ اگر یہ چمنی نہ ہوتی۔ تو دنیا اب تک بھسم ہو گئی ہوتی۔ ذرا خیال کرو۔ اگر تمام لوگ دھرم کو سمجھ لیتے اور اسے آرام سے لگ کر لیتے۔ تو دنیا کا کارو بار کتنے دن چلتا۔ کئی لوگ ایسے ہیں۔ جو دھرم کی آگ پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔ لیکن رستے میں چمنی آ جاتی ہے۔ زندگی بچ جاتی ہے۔ لیکن سقراط اور گلیلیو جل کر مر گئے۔ اسی طرح حُسن دولت اور عزت کی آگ میں ہزاروں لوگ جل کر مرتے رہتے ہیں۔ ان کی موت کے بیان کو لوگ شاعری کہتے ہیں۔ مہابھارت کے مصنف نے بے عزتی کی آگ جلائی اور اس کے شعلوں میں دریودھن نامی پروانے کو بھون

ڈالا —————— دنیا کو ایک شعروسخن کی لاثانی کتاب ہاتھ آگئی۔ علم کی آگ میں جلنے کے گیت پیرے ڈائس لاسٹ میں گائے گئے ہیں۔ مذہب کی آگ کا پروانہ سینٹ پال گنا جاتا ہے۔ نفس کی آگ میں انطنی اور کلیوپیٹرا جل کر بھسم ہو گئے۔ حُسن کی آگ پر رومیو اور جولیٹ نثار ہوئے۔ نار حسد او تھیلو ہیں اور آرام کی آگ گیت گو بندا ورود یا سندریں دہک رہی ہے۔ محبت کی آگ میں ستی سیتا کو جلانے کے لئے راماین طیار ہوئی ۔

آگ کیا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ حُسن، جمال، فعل حرکت وغیرہ الفاظ قطعی بے معنی و بے مصرف ہیں۔ یہاں پر منطق، سائنس، مذہب شعروسخن سب کو شکست ہوتی ہے۔ پرماتما کیا ہے؟ مذہب کیا ہے؟ سائنس کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟ ان تمام امور کی واقفیت سے ہم سراسر محروم ہیں۔ مگر پھر بھی ان کے گرد طواف کرنے سے باز نہیں آتے۔ تو —————— کیا ہم پروانے نہیں ۔

لہٰذا اے پروانو! دیوانے نہ بنو۔ میری نصیحت سنو! اگر ہمت ہے تو کود کر جان نثار کردو۔ ورنہ خواہ مخواہ آس پاس پھرنے سے کیا فائدہ؟ ہاں بھربھوں بھن بھن کرنے کا شوق ہو۔ تو میں بھی حاضر ہوں۔ مگر اس سے آگے جانے کی جُراَت نہیں ۔
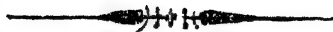
سالانہ رپورٹ

دنیائے اخبارات میں یہ رسم پڑ گئی ہے۔ کہ سال نو کے آوائل میں گذشتہ سال اور اس کے تمام واقعات پر رائے زنی کی جائے۔ للنا چونکہ اخبار نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس رسم کی پابندی پر مجبور نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ہمیں اس کا افسوس ہے۔ جس طرح بہت سے لوگ راجہ نہیں ہوتے لیکن پھر بھی راجوں کی سی شان و شکوہ سے رہتے ہیں۔ جس طرح بہت سے لوگ فی الاصل ہندوستانی ہیں۔ لیکن آپ کو صاحب بہادر جانتے اور مانتے ہیں۔ اور اس شوق میں کوٹ پتلون کی بلا کو گلے سہیٹر پہنتے ہیں اسی طرح للنا ماہواری رسالہ ہوتے ہوئے بھی اگر اس حق کو حاصل کرنا چاہے۔ جو زبردست ہفتہ وار اخبارات ہی کو میسر ہے۔ تو اس میں قابل اعتراض بات کونسی ہے؟

لیکن انسان کی ایسی بدقسمتی ہے۔ کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو قدرت اس میں روکاوٹ ڈال دیتی ہے۔ نیا سال چیت کے مہینے میں گذر گیا۔ ہم ویسی لوگ ہیں۔ ہمارے بزرگ بھی دیسی تھے۔ ان کا سال اسی مہینے میں شروع ہوا کرتا تھا۔ جو صاحب بن گئے تھے۔ جن کو تہذیب

---

[1] یہ مضمون پہلے للنا نامی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔

کی ہوا لگ گئی ہے۔ جو زمین پر نہ بیٹھ کر میز پر کھانا ہی لیاقت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ ان کا سال تو کسی اور مہینے میں شروع ہوتا ہے۔ مگر ہم ٹھہرے بدتہذیب کالے نیٹو۔ ہمارا سال بھی نیٹو ہے۔ وہ چیت مہینے میں شروع ہوتا ہے۔ مگر اب چیت گذر چکا ہے۔ اور للتا کے مضامین ہی تیار نہیں ہوئے۔ لیکن کوئی کرے بھی کیا۔ یہ ہندوستانیت ہم کو لیٹ رکھتی ہے۔ اگر ہم یہ رسالہ بنگالی میں نہ نکال کر انگریزی میں نکالتے۔ اور صاحب لوگوں کا ساٹھاٹ اختیار کر لیتے تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ مگر ہندوستانیت ہمارے دل میں بسی ہوئی ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ رسالہ للتا بھی اُسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اگر وقت پر نکل جائے۔ تو ہماری ہندوستانی برادری اسے "چھیک" دے۔ اور غریب اڈیٹر کا حقہ پانی بند کر دے۔ اور چلا چلا کر کہہ دے۔ کہ یہ کرانی ہو گیا ہے۔ اس لئے چیت گذر گیا ہے تو کیا ہوا سال گذشتہ کی رپورٹ ہم ضرور لکھیں گے۔ اس لئے گذرے ہوئے سال! خبردار ہو جاؤ۔

سال گذشتہ کے متعلق مختلف رپورٹوں سے جو مختلف محکموں کے حکام نے مرتب کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سال میں پورے تین سو پینسٹھ ایام تھے۔ ایک دن کا بھی فرق نہ تھا۔ ان ایام میں سے ہر ایک یوم میں چوبیس گھنٹے اور ہر ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ تھے۔ رپورٹیں بتلاتی ہیں۔ کہ ان میں مطلقاً کمی نہیں ہوئی۔ اراکین حکومت نے اِن میں ذرّہ بھر بھی دست اندازی نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حکومت کا کام نہایت ذمہ وار ہاتھوں میں ہے۔ اور ہر قسم کی دستبُرد سے محفوظ ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے۔ کہ اگر اس سال

ہیں کچھ دن کم کر دیئے جاتے۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ لیکن ہم اس کے حق میں نہیں۔ کیونکہ دن کم کرنے سے صرف ملازمت پیشہ لوگوں کو تنخواہ کا قدرے فائدہ رہ جاتا۔ اور روزانہ اخبارات کے ایڈیٹروں کی محنت بچ جاتی۔ مگر عوام کو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا —— ہمارا رسالہ ماہوار ہے۔ کیا کوئی گیارہ نمبر لے لیتا۔ دن چاہے چار کم ہو جاتے۔ مگر پرچے بارہ ہی نکلتے۔ ہاں اگر موسم گرما بالکل نہ ہوتا۔ تو لوگ بہت آرام میں رہتے۔ ہم اراکین حکومت سے اصرار کرتے ہیں۔ کہ وہ اگلے سال کوشش کریں کہ بارہ مہینوں سردی ہی رہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت رنج و قلق ہوا ہے۔ کہ اس سال سب لوگوں کی عمروں میں ایک سال کی کمی ہو گئی ہے۔ لیکن ہمیں اس پر یقین نہیں آتا۔ ہم صاف دیکھ رہے ہیں۔ کہ جو ۲۵ سال کے تھے۔ وہ ۲۶ سال کے ہو گئے ہیں۔ جن کی عمر پہلے ۳۰ سال کی تھی۔ ان کی اب ۳۱ سال ہو گئی ہے۔ یہی وہ کہتے ہیں اور یہی مانتے ہیں۔ اگر حقیقت عمریں کم ہو گئی ہیں۔ تو یہ سال بڑھ کیسے گیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکومت کے بدخواہوں نے یہ غلط خبریں مشہور کر دی ہیں۔ لوگوں کو چاہئے۔ کہ ایسی بے بنیاد اور نغو افواہوں پر مطلقاً اعتبار نہ کریں۔

اس سال کی عمر گی کا ایک اور ثبوت یہ ہے۔ کہ اس میں کئی لوگوں کے ہاں اولاد پیدا ہوئی ہے۔ رپورٹیں بتاتی ہیں۔ کہ بعض لوگوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئی ہیں اور بعض کا حمل اسقاط ہو گیا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ اس

سال بعض آدمی مرگئے ہیں۔ جو اگر نہ مرتے۔ تو آبادی میں بہت اضافہ ہوجاتا۔ سنا ہے۔ کہ اس ملک کی کوئی مشہور سوسائٹی پارلیمنٹ کے سامنے رزولیوشن پیش کرنے والی ہے۔ کہ ہندوستان میں لوگ مرنے نہ پائیں۔ ہاں اگر کسی کو ضروری مرنا ہو۔ تو لازمی ہے۔ کہ وہ پہلے پولس میں رپورٹ کرکے منظوری لے لیا کرے؛

اس سال فائننشل ڈیپارٹمنٹ کا کام نہایت عجیب رہا ہے۔ ہم نے سنا ہے۔ کہ گورنمنٹ کو آمدن بھی ہوئی۔ اور اس کو خرچ بھی کرنا پڑا۔ یہ بات عجیب ہو یا نہ ہو۔ لیکن بلاشبہ یہ تو نہایت تعجب خیز ماجرا ہے۔ کہ آمدن اور خرچ میں گورنمنٹ کو یا تو نقصان رہا ہوگا۔ یا کچھ رقم بچی ہوگی۔ یا حساب برابر رہا ہوگا۔ اس سال کوئی ٹیکس عاید کیا جائیگا یا نہیں۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ بہ وثوق کہا جا سکتا ہے۔ کہ سال آئندہ میں ضرور ٹیکس لگایا جائیگا؛

اس دفعہ ہم عدالتوں کے کام کی خاص طور پر تعریف نہیں کر سکینگے۔ یہ درست ہے۔ کہ جن جن لوگوں نے نالش دائر کی ہے۔ ان کی شنوائی ہوئی ہے یا ہونے کا امکان ہے۔ لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جن لوگوں نے نالش دائر نہیں کی۔ ان کی مطلقاً شنوائی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں کھلی عدالتیں ہیں۔ وہاں کوئی نالش کرے یا نہ کرے۔ سب کی سماعت ہونی چاہیئے۔ کوئی دھوپ چاہے یا نہ چاہے۔ لیکن آفتاب اس کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ اور ہر جگہ اپنی نرم وگرم حرارت چھڑکتا رہتا ہے۔ کوئی بارش کا مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ لیکن ابر جب جوش کرم پر مایل ہوتا ہے۔ تو جل تھل کو ایک

کر دیتا ہے۔ کسی کی کھیتی اجڑ جائے۔ یا کسی غریب کا مکان بہ جائے وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس کو تو مہربانی کرنا ہے۔ وہ بغیر دیکھے سُنے کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح عدالتوں کو گھر گھر جاکر انصاف کرنا چاہئیے۔ یہ ممکن ہے۔ کوئی اعتراض کرے۔ کہ اگر ملازم لوگ اس طرح مقدمات کی سماعت کرنے لگیں گے۔ تو گرہستی لوگوں کا جھاڑو اُن کے داخلے میں ہارج ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ملازم لوگ جھاڑو کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ جھاڑو کے ساتھ چھوٹے درجہ کے ملازموں کا تو خاص تعلق ہے۔ اور قریبًا ہر روز اس کے ساتھ ان کی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مور کو سانپ پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو جھاڑو پیارا ہے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ گورنمنٹ کے کسی ملازم نے تجویز پیش کی ہے۔ کہ جس طرح بڑے درجہ کے حاکموں کو آرڈر آف دی سٹار آف انڈیا کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نچلے طبقہ کے ملازمین کے لئے آرڈر آف دی بروم سٹک کا اعزاز قایم کیا جائے۔ اور خاص خاص کارندوں کو چن کر انہیں جھاڑو شیر بنایا جائے۔ اور ان کے گلے میں تمغے کے طور پر لٹکایا جائے۔ اس سے ان کی شان میں ایک روپیہ ڈھائی آنہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ خطاب بُرا ہے۔ اس لئے لوگ اس سے احتراز کریں گے۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہوگا تو لوگ اِسے بڑے چاؤ سے منظور کریں گے۔ ہاں شک اس امر کا ہے کہ اس کے امیدواروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جائے گی۔ کہ سب کو یہ خطاب دینا مشکل ہو جائے گا۔

پچھلے سال بارش ہوئی تھی۔ لیکن سب جگہ یکساں نہیں ہوئی۔

جہاں کی زمین اس نعمت سے محروم رہی ہے۔ وہاں کے اہالیان نے گورنمنٹ کو عرضی بھیجی ہے۔ کہ اس قسم کی تجویز سوچی جانی چاہیئے۔ جس سے بارش سب مقامات پر یکساں ہؤا کرے۔ ہماری رائے ہے۔ کہ اس مدعا کے حصول کے لیئے ایک کمیٹی مرتب ہونی چاہیئے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے۔ کہ اگر بادلوں کا محنتانہ مقرر کر دیا جائے۔ تو انہیں کسی حصہ ملک میں جانے میں بھی عذر نہ ہوگا۔ لیکن ہمارا خیال ہے۔ کہ اس سے بھی دقت رفع ہونے کا امکان نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی بادل بجلی کو بہت چاہتے ہیں۔ وہ اُسے چھوڑ کر محنتانہ کے لئے بھی باہر جانا منظور نہیں کریں گے۔ ہماری تجویز یہ ہے۔ کہ تمام بادلوں کو برخاست کر دیا جائے۔ اور ان کی بجائے بہشتیوں سے کام لیا جائے۔ ہر ایک ملازم یا چپراسی ایک ایک بہشتی کو لمبے بانس میں باندھ کر کھڑا رہے۔ جب ضرورت ہو بہشتی پانی چھوڑ کر، یا اگر ہو سکے۔ تو نیچے اتر کر زمین سیراب کر دے۔ ہمارے خیال میں یہ تجویز پورے طور پر کامیاب ثابت ہوگی۔ اور اس سے تمام تکلیفات رفع ہو جائیں گی ؎

ہمارے ملک کی عورتوں میں حُب الوطنی کا جذبہ تا حال پیدا نہیں ہؤا۔ ورنہ بہشتیوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر وہ گرہستھی کا رونا کھیتوں میں جا کر رویا کریں۔ تو بادلوں اور بہشتیوں —— دونو کی ضرورت نہ رہے۔ کھیت ان کے آنسوؤں ہی سے سیراب ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں بادلوں کا محکمہ بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے۔ کہ اس نئے انتظام میں پولس کا انتظام بہت زبردست ہو ورنہ ان نئے بادلوں کی بجلی گرنے سے کون جانتا ہے۔ کہ کسانوں کے لڑکوں پر کیسی کیسی

مصیبتیں ٹوٹ پڑیں گی۔ ان کی حفاظت اگر پولیس نہ کرے گی۔ تو اور کون کرے گا؟

سنا ہے محکمہ تعلیم میں کچھ گڑ بڑ مچ گئی ہے۔ کئی سکولوں کے طلباء نے کان ماپنے کے گز تیار کئے ہیں۔ ان کے دلوں میں شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ استادوں اور پروفیسروں کے کان ماپ کر دیکھیں گے۔ نہیں تو ان سے پڑھنا بند کر دیں گے۔ ہمارے خیال میں کان سے گز کے چھوٹا ہونے کا کہیں بھی امکان نہیں۔

بہرحال سال بھلا ہو یا بُرا۔ اس پر غور کرنے سے ہم تین نتائج پر پہنچے ہیں:۔

۱۔ سال گذر گیا۔ اس میں مطلقاً شبہ نہیں۔

۲۔ چونکہ گذر گیا ہے۔ اس لئے اب واپس نہ لوٹے گا۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی کوشش نہ کرے۔

۳۔ لوٹے یا نہ لوٹے۔ ناظرین ہمارے لئے دونوحالتیں یکساں ہیں۔ کیونکہ ہمارے لئے پچھلے سال بھی گھاس پانی۔ اور اس سال بھی گھاس پانی۔ اور اگلے سال بھی گھاس پانی۔ رام بھلا کرے۔ آپ گھاس پانی کی بات یاد رکھیں ——— ہاں۔
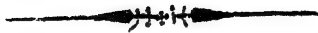
ایک سپیشل کی چٹھی

پرنس آف ویلز کے ساتھ ایک سپیشل وقائع نگار صاحب آئے تھے۔ انہوں نے لنڈن میں واپسی پر ایک ولایتی اخبار میں ایک چٹھی شائع کرائی ہے۔ اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اگر ناظرین اس اخبار کا نام جاننا چاہیں۔ تو ہمیں افسوس ہے۔ ہم ان کی خواہش پوری نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ نہ تو ہمیں اس اخبار کا نام یاد ہے۔ نہ یہ بات یاد ہے کہ چٹھی کہاں دیکھی تھی۔ اور کب دیکھی تھی۔ ہاں اُس چٹھی کا خلاصہ یہ تھا:۔

"پرنس آف ویلز کے ساتھ بنگال میں آکر میں نے جو کچھ دیکھا۔ وہ ناظرین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اس حصہ ملک کے متعلق میں نے بہت کچھ تحقیقات کی۔ اس لئے میرا بیان مستند ہے۔ اور اس طرح وثوق کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ جس طرح میں لکھ سکتا ہوں۔ اس حصہ ملک کو بنگال کہتے ہیں۔ بنگال کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ اسے بنگالی نہیں جانتے۔ ان کا بیان ہے۔ کہ پہلے اس حصے کو بنگ کہا جاتا تھا۔ جو بعد میں بنگال یا بنگالہ بن گیا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اس حصے کا اصلی نام بنگال نہیں بلکہ بینگال ہے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے

کہ جو لوگ اس کا نام بنگال بتلاتے ہیں۔وہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ قرین قیاس ہے۔کہ اس حصّہ کو بنجمن گال نامی کسی انگریز نے آباد کیا ہو۔اور اس کا نام اپنے نام پر بنجمن گال رکھ دیا ہو۔جو مخفف ہو کر بین گال (بینگال) رہ گیا ہو۔

بنگال کا دارالسلطنت کلکتہ ہے۔دراصل یہ کال کٹا ہے۔اور یہ دونو لفظ بنگالی زبان کے ہیں۔کال کے معنی وقت اور کٹا کے معنی کاٹنا۔یعنی وقت گذارنے کا مقام۔چونکہ یہاں دل بہلاوے اور وقت گذارنے کے مشغلے بیشمار ہیں۔اس لئے اس کا نام کلکتہ نہایت موزوں ہے۔

یہاں کی آبادی سیاہ فام بھی ہے۔اور قدرے سفید رنگ کی بھی۔ جو بالکل کالے ہیں۔ان کے آباو اجداد معلوم ہوتا ہے۔افریقہ سے آئے ہوں گے۔کیونکہ ان کالے بنگالیوں میں سے اکثر کے بال گھونگھریالے ہیں۔اور گھونگھریالے بال افریقہ کی آبادی کا ذریعہ شناخت ہیں۔یہ امر مصدقہ ہے۔جسے رد کرنا قطعاً ناممکن ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے۔کہ گورے آدمی کون ہیں۔جہاں تک میرا خیال ہے۔یہ گورے بنگالی بنجمن گال نامی صاحب کے خاندان کے ہوں گے۔اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

ایک اور بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔وہ یہ ہے۔کہ بنگال والے مانچسٹر کی دھوتیاں پہنتے ہیں۔لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل قدرتی ہے کہ جب مانچسٹر سے وہاں دھوتیاں نہیں جاتی تھیں۔اس وقت بنگالی برہنہ رہتے ہوں گے۔لیکن اب مانچسٹر کے دستِ کرم نے ان کی عریانی ڈھانپ دی ہے۔تاہم وہ ابھی تک وحشی ہیں۔وہ اب تک

اتنا بھی نہیں جانتے۔ کہ کپڑا کس طرح پہننا چاہیئے۔ کوئی ہم لوگوں کی مانند کوٹ پہنتا ہے۔ کوئی ترکوں کی طرح پاجامہ استعمال کرتا ہے۔ اور جس کو اس نقل کی بھی تمیز نہیں۔ وہ کمر کے گرد دھوتی لپیٹ لیتا ہے ؎

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ برٹش گورنمنٹ نے ایک ہی صدی میں ننگے رہنے والے بنگالیوں کو کپڑا پہننا سکھا دیا ہے۔ انگلستان کے فیض سے ان کی ترقی وبہبودی میں کس قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ اور وہ تہذیب کے باب میں کس طرح چھلانگیں مار کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ سب ایسے امور ہیں۔ جن سے بے وقوف اور نیم وحشی ہندوستانی سراسر ناآشنا ہیں۔ ان کو تمدن سے کیا سروکار؟

افسوس ہے کہ اس چند روزہ سیاحت کے دوران میں میں بنگالی زبان نہیں سیکھ سکا۔ ہاں ہاں کس حد تک واقفیت ہوگئی ہے گلستان اور بوستان نامی دو بنگالی کتابوں کا ترجمہ دیکھنے کا مجھے موقع میسر ہوا۔ ان دونوں کتابوں کا لب لباب یہ ہے۔ کہ یدھشٹر نام کے ایک بادشاہ نے راون نامی ایک دوسرے راجہ کو ہلاک کرکے اس کی رانی مندودری کو چرا لیا تھا۔ کچھ دنوں تک مندودری برندابن میں کرشن کے ساتھ عیش کرتی رہی۔ آخر میں اس کے باپ نے کرشن کو اپنے یگیہ میں مدعو نہ کیا۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو آگ میں جلا کر خودکشی کرلی ؎

بنگالی کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اس سے ایک امر روز روشن کی مانند عیاں ہے۔ اور وہ یہ کہ اس زبان میں گورنمنٹ کو گورنمنٹ، ہائی کورٹ کو ہائی کورٹ، ڈسمس کو ڈسمس، ڈگری کو ڈگری، ریل کو ریل اور ڈبل کو ڈبل کہتے ہیں۔ اس سے مجھے یہ بھی شبہ ہوتا ہے۔ کہ جب

بنگالی زبان انگریزی کی لڑکی ہے تو انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں کوئی زبان بولی جاتی تھی یا نہیں ——— یہ امر بحث طلب ہے۔ دیکھئے ہمارے کرائسٹ کے نام پر انہوں نے کرشن بنالیا ہے۔ اور کئی یوروپین علما کا قول ہے۔ کہ کرشن کی بھگوت گیتا صریح طور پر بائیبل کا ترجمہ ہے۔ اس لئے صاف ظاہر ہے۔ کہ زمانہ بائیبل سے پیشتر یہاں کوئی زبان مکمل نہ تھی۔ اس میں مطلقاً شبہ نہیں[۱]۔ اس کے بعد کب اُنکی زبان بنی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید میکسمولر صاحب اس کے متعلق کچھ بتا سکیں۔ جس عالم نے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اشوک کے زمانہ سے پہلے قدیم آریہ فن تحریر سے نابلد تھے۔ وہی اس عقدے کو حل کر سکتے ہیں۔

ایک بات اور۔ سر ولیم جونس سے لے کر میکسمولر تک تمام مشرقی زبانوں کے ماہرین کا خیال ہے۔ کہ ہندوستان میں سنسکرت نامی ایک زبان ہے۔ لیکن ہندوستان میں اپنے زمانہ قیام کے دوران میں مَیں نے تو کسی کو نہ سنسکرت بولتے سُنا۔ نہ لکھتے دیکھا۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ سنسکرت زبان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ بالکل فرضی نام ہے۔ جو سر ولیم جونس وغیرہ علما کے دماغوں کی اختراع ہے۔ اگر یہ زبان دراصل ہوتی۔ تو مجھے معلوم نہ ہو جاتا۔ وہاں کی تمام زبانیں میں سُن آیا ہوں لیکن سنسکرت کا کسی سے نام بھی نہیں سُنا۔ اس لئے میرا دعویٰ ہے۔ کہ اس کے بارے میں جو کچھ بیانات سر ولیم جونس وغیرہ فضلا نے شائع کئے ہیں۔ وہ محض اپنی علمیت کے اظہار کے لئے ہیں۔ بجا ایک

---

[۱] مسٹر لونز ر۔

وہ حقیقت سے کوسوں دور ہیں[ا] ٭

خیر! اب میں ان لوگوں کی تمدنی حالت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات کو یہی معلوم ہوگا۔ کہ ان کی چار ذاتیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ان کی کئی ذاتیں ہیں۔ جن کے نام مفصلہ ذیل ہیں :۔

(۱) براہمن (۲) کائستھ (۳) شودر (۴) کلیں (۵) دنشنبج (۶) ولشینو (۷) شاکت (۸) رائے (۹) گوشال (۱۰) ٹھاکر (۱۱) ملا (۱۲) فرازی (۱۳) لمائن (۱۴) آسام (۱۵) گوال پاڑا (۱۶) پار یا ڈوگس ٭

بنگالیوں کا چال چلن بہت خراب ہے۔ یہ پرلے درجہ کے جھوٹے ہوتے ہیں۔ اور بغیر مطلب کے جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے بتلایا گیا۔ کہ بنگالیوں میں بابو راجیندر لال متر بڑے زبردست عالم ہیں میں نے کئی بنگالیوں سے دریافت کیا۔ کہ وہ ذات کے کون ہیں ؟ سب نے جواب دیا کائستھ۔ لیکن میں کیسے دھوکا کھا سکتا تھا۔ میں نے پڑھا ہوا تھا۔ کہ وہ براہمن ہیں[۲] یہ متر لفظ مترے سے بگڑا ہوا ہے۔ لہٰذا لازمی ہے۔ کہ وہ پروہت ذات کے ہوں ٭

بنگالیوں میں ایک خاص بات یہ ہے۔ کہ وہ راج بھگت کمال کے ہوتے ہیں۔ پرنس آف ویلز کو دیکھنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹ پڑتے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ دنیا میں ان سے بڑھ کر راج بھگت کوئی نہیں۔ پرماتما ہمارا بھلا کرے۔ کیونکہ ہماری بہتری سے ان غریب لوگوں کی بہتری ہے ٭

[ا] ناظرین ہنسیں نہیں۔ مشہور فاضل اجل ٹوگالڈ سٹوارٹ صاحب کا یہی خیال ہے۔

[۲] جیمس فرام اے جرمن ورتیپ ٭

سنا ہے۔ بنگالی اپنی مستورات کو پردے میں رکھتے ہیں لیکن یہ بات بالکل درست نہیں ہے۔ جہاں کوئی فائدہ نہ ہو۔ وہ پردہ نشین رہتی ہیں لیکن جہاں فایدہ نظر آئے۔ وہاں جھٹ پردہ پرے پھینک دیتی ہیں۔ یہ اپنی مستورات سے اسی طرح سلوک کرتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ شکاری بندوق سے کرتے ہیں۔ جب تک کام نہ ہو۔ اسے چھپا کر رکھتے ہیں لیکن جب شکار نظر آتا ہے۔ فوراً بندوق باہر نکل کر ڈز کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب تک کام نہ ہو۔ ان کی عورتیں پردے میں رہتی ہیں۔ لیکن کام پڑنے پر فوراً باہر نکل آتی ہیں۔ ہماری گوییوں سے تو غریب چڑیاں ہی ہلاک ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے تیر نگاہ سے خدا جانے کون کون گھائل ہوتا ہے۔ ان عورتوں کے گہنوں کے اثرات دیکھ کر مجھے ترغیب ہوئی کہ میں بھی بندوق کو دو چار زیورات بنوا دوں۔ شائد اس سے چڑیاں خود بخود بندوق کے پاس آجایا کریں۔ بنگالنیں صرف تیر نگاہ چلانے ہی میں نہیں۔ پھولوں کے تیر چلانے میں بھی کامل ماہر ہیں۔ ہندوؤں کی کتب میں جن پھولوں کے تیر کا ذکر آتا ہے۔ پتہ نہیں۔ اس کا ان تیروں سے کچھ علاقہ ہے یا نہیں۔ میں نے ایک بنگالی شاعر کی نظم میں پڑھا تھا:۔

پھول بان کیسے دھاروگی دھنش تمارے تا ہیں

اس کو یوں بھی پڑھا جاتا ہے:۔

پھول بان نے نار دیئے لاکھوں کے تلچھت پران

پرماتما کرے۔ یہ پھولوں کے تیر ہندوستان سے اٹھ جائیں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ نہیں تو بنگال میں انگریزوں کا رہنا دشوار ہے۔ ہم بنئے کی ذات دوکاندار کے لڑکے ٹھہرے۔ دو پیسے پیدا کرنے کے لئے

"ہندر پارسے ہندوستان جاتے ہیں۔کون جانے ان بنگالنوں کا پھول تیر کب ہمارے شامیانہ میں آ لگے اور ہمارا جسم بے سدھ ہو جائے۔اس وقت کون ہمیں پانی دیگا؟

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں۔کہ تمام بنگالنیں ہی اس قسم کی شکاری بندوقیں ہیں۔ہاں میں نے سنا ہے کہ بعض اس باب میں لاجواب ہیں۔ہندوؤں کے چار وید ہیں۔ان میں چانکیہ شلوک نامی وید میں لکھا ہے:-

आत्मानं सततं रक्षेत दारैरपि धनैरपि ॥

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ"اے خوبصورت آنکھوں والے کرشن! میں اپنی ترقی کے لئے تمہارے گلے میں یہ جنگلی پھولوں کا ہار پہناتی ہوں۔اسے پہن لو"

بلّی

رات کا وقت تھا۔ میں اپنی خوابگاہ کی کوٹھڑی میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اور اونگھ رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور دیوار پر سایہ بھوت بن بن کر ناچ رہا تھا۔ ابھی تک بھات تیار نہ ہوا تھا اس لئے میں آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا۔ کہ اگر میں نپولین بونا پارٹ ہوتا تو واٹرلو کے میدان جنگ میں فتح حاصل کر سکتا یا نہ۔ معاً ایک آواز آئی "میاؤں"

میری آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن یکایک کچھ سمجھ نہ آیا ۔ بعد میں خیال ہوا۔ کہ شائد ڈیوک آف ویلنگٹن بلی کی شکل اختیار کر کے بھنگ مانگنے آیا ہے۔ میں نے دل کڑا کر کے فیصلہ کیا۔ کہ کہہ دوں۔ جائیے موج کرو تمہیں کافی انعام مل چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہو۔ دامن حرص اس قدر دراز کرنا درست نہیں۔ اتنے میں ڈیوک پھر بولا "میاؤں"

تب میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ ویلنگٹن نہیں۔ ایک چھوٹی سی بلّی تھی۔ میرے سرہانے جو پینے کے لئے دودھ کا کٹورا رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے بڑے اطمینان سے پی چکی تھی۔ میں جس وقت واٹرلو کے میدان میں صف بندی کے نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس وقت بلّی میرا دودھ پی

رہی تھی۔ اور اب سیر ہو کر زبان ہونٹوں پر پھیر رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی "میاؤں"

میں ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر میرا خیال ہے۔ کہ بلی کی میاؤں میں طنز پوشیدہ تھی۔ شائد وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی تھی اور کہتی تھی کہ کوئی کمائے۔ کوئی کھائے۔ تمہارا دودھ تو میں پی گئی۔ اب تم کیا کرو گے؟"

کرتا کیا؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں لگتا تھا۔ کہ کیا کہتا اور کیا کرتا۔ دودھ میرے باپ کا نہیں تھا۔ دودھ تھا گائے کا۔ اور اسے دوہنے والی تھی گوالن' اس پر جیسا حق میرا ہے۔ ویسا ہی بلی کا بھی ہے۔ اس باعث سے میں اس پر اظہار غم و غصہ نہ کر سکا۔ مگر عرصہ دراز سے رسم جاری ہے۔ کہ بلی دودھ پی جائے۔ تو اسے مارا جاتا ہے۔ اس رسم کو توڑ کر بدنام ہونا بھی گوارا نہ تھا[1]۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا۔ کہ اگر میں خاموش رہا۔ تو ممکن ہے۔ بلی اپنی برادری میں جا کر مجھے بزدل کہیئے۔ اس خیال سے میں نے یہی فیصلہ کیا۔ کہ مردانجی کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ پس تلاش بسیار کے بعد ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی لے کر بلی کو مارنے کے لئے اٹھا۔

بلی مجھے پہچانتی تھی۔ لکڑی دیکھ کر بھی وہ ٹھہری رہی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ایک جمائی لی۔ اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے لکڑی پکڑ کر کہا۔ ماروں تیری کمر میں ایک دو تین۔ کمبخت میرا دودھ پی گئی ہے۔ بلی نے پنجہ چاٹنا شروع کر دیا۔ مجھے ملائی والا دودھ یاد آ گیا۔ میں، افسوس کرتا ہوا چارپائی پر جا بیٹھا اور حقہ پینے لگا۔

بلی نے کہا "میاؤں"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا بلی کہہ رہی ہے۔

[1] بنگال میں بلی کو دودھ پی جانے پر مارنے کی رسم جاری ہے۔

"مارتے کیوں ہو؟ ذرا آرام سے حقہ پیو اور غور کرو۔ کیا دنیا کی تمام اشیا ــــــ دودھ، دہی، مکھن، ملائی، حلوہ بھات محض تمہارے ہی لئے ہے۔ کیا ان اشیا میں ہمارا حصہ نہیں ہے؟ تم آدمی ہو۔ ہم بلیاں ہیں۔ مگر ہم میں اور تم میں فرق کیا ہے۔ کیا ہم کو بھوک نہیں لگتی؟ کیا ہم کو پیاس کا احساس نہیں ہوتا۔ تم کھاتے ہو ہم خاموش رہتے ہیں۔ مگر جب ہم ذرا پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ تو تم لاٹھی اٹھا لیتے ہو اس بدتہذیبی کے کیا معنی ہیں؟ ہم سے سبق حاصل کرو۔ ورنہ مر کر تمہاری نجات نہ ہوگی۔ تمہارے سکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو ہم سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے"۔

"دیکھو! پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پینے والے آدمی! دھرم کیا ہے؟ دوسروں کو فیض پہنچانا دھرم ہے۔ اس دودھ سے میری بھوک مٹی۔ دودھ تمہارا تھا۔ لہٰذا تم نے دھرم کمایا ہے۔ میں نے چوری کی یا ڈاکہ ڈالا لیکن تم اتنا یاد رکھو۔ کہ تمہارے اس دھرم کی کمائی کا حقیقی ذریعہ میں ہوں۔ اس لئے بجائے اس کے تم مجھے لاٹھی دکھاتے، گالیاں دیتے۔ تمہیں چاہئے تھا۔ کہ تم میری تعریف کرتے کہ میں نے تمہیں دھرم کا راستہ دکھایا ہے۔ تم سے دھرم کا کام کرایا ہے"۔

"تم کہو گے۔ میں نے چوری کی۔ ٹھیک۔ لیکن یہ تو بتلاؤ۔ یہ چوری کیا میں شوق سے کرتی ہوں۔ جسے کھانے کو بآسانی تمام دستیاب ہو سکتا ہو وہ چوری نہیں کر سکتا۔ اور نہیں کرتا۔ بڑے بھاری سادھو مہنت ایماندار سمجھے جاتے ہیں۔ جو چوری کا نام سن کر لرز جاتے ہیں۔ وہ چوروں سے بھی بڑھ کر مجرم ہیں ــــــ انہیں چوری کرنے کی ضرورت

نہیں پڑتی۔اس لئے وہ چوری نہیں کرتے۔لیکن ضرورت سے زیادہ اشیاء ہونے پر بھی وہ غریبوں کی طرف دھیان نہیں کرتے۔اسی لئے چور چوری کرتے ہیں۔گویا گناہ کا مرتکب چور نہیں ہوتا۔بلکہ وہ ایماندار آدمی ہوتا ہے۔جو آپ کھاتا ہے۔مگر دوسروں کو کھانے نہیں دیتا۔اس کی ایمان داری ہی دوسروں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔چور پکڑا جاتا ہے۔اسے سزا ہو جاتی ہے۔لیکن چوری کی جڑھ کنجوس کو کوئی نہیں پوچھتا۔کہ تم نے یہ کیا فساد ڈال رکھا ہے۔جو دن رات چوریاں کراتے رہتے ہو۔

"میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں میاؤں میاؤں کرتی پھرتی ہوں مگر تم لوگ مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیتے۔لوگ بچی ہوئی خوراک کتوں کو ڈال دیتے ہیں۔نالی میں پھینک دیتے ہیں۔مگر میرا خیال ہی نہیں کرتے۔تمہارا پیٹ بھرا ہوا ہے۔تم فاقہ کشی کا عذاب کیا جانو۔افسوس! غریب سے اٹھا۔ہمدردی میں کیا تمہاری شان کم ہو جاتی ہے۔اسے دو روٹیاں دے دیا کرو۔کیا ہرج ہے۔رات کو اگر کھاٹ تک چور نے جائیں۔تو بک کر پڑے رہو گے۔لیکن بلی دودھ کا کٹورا پی لے۔ تو لکڑی ڈھونڈتے ہو۔یہ کیوں؟

دیکھو۔اگر رائے بہادر دیوی داس یا خاں صاحب کریم بخش تمہارا دودھ پی جاتا۔تو تم اسے کیا مارنے کو تیار ہو جاتے۔نہیں ہاتھ باندھ کر کہتے "جناب کیا کچھ اور لاؤں" پھر حضرت! میرے لئے لکڑی کیوں تم کھو گے۔وہ بڑے آدمی ہیں۔عالم فاضل ہیں۔مگر سوال تو یہ ہے۔ کہ کیا ان کو ہم سے زیادہ بھوک لگتی ہے۔نہیں۔تو پھر تم لوگ کرتے

کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جسے ضرورت نہیں۔ انہیں دینے کی انسان کو عادت ہے۔ غریب مفلس کو کوئی نہیں دیتا۔ جو نہیں نہیں کرتے ہیں۔ ان کو کہتے ہو۔ تھوڑا سا کھا لو۔ چلو یار کیا ہرج ہے۔ آج ہمارا کچن پاکیزہ کرو۔ مگر جو مانگتے ہیں۔ جن کے پیٹ خالی ہیں۔ ان کو دیتے وقت تمہارا دل چھوٹا ہوجاتا ہے۔ اور اگر وہ بے تکلفی سے خود ہی لے لیں۔ تو لاٹھی اٹھا لیتے ہو۔ اس کا کیا باعث؟

"ہماری حالت دیکھو۔ دربدر مانگتی پھرتی ہیں۔ میاؤں میاؤں کرتی رہتی ہیں ——— کوئی روٹی کا ٹکڑا نہیں دیتا۔ ہاں اگر کسی بلی کو اپنے ہاں رکھ لیتے ہو۔ تو اس کی بڑے چین سے گزرتی ہے اور وہ چند ہی دنوں میں اس قدر موٹی تازی اور مضبوط ہوجاتی ہے جیسے کسی بڈھے کے گھر رہنے والا اس کی خوبصورت اور جوان بیوی کا بھائی' یا بیوقوف موٹے مل رئیس کے پاس رہنے والا شطرنج کا کھلاڑی خوشامدی مصاحب اس بلی کی اتنی خاطر تواضع ہوتی ہے۔ کہ اس کی دم پھول جاتی ہے۔ اور جسم کے عضو عضو میں چستی لہرانے لگتی ہے۔ اس کے جسم کا فربہ پن دیکھ کر بہت سی بلیاں شعر کہنے لگ جاتی ہیں۔

"اور اس کے مقابلے میں ہمارا کیا حال ہے۔ فاقہ کشیوں کے مارے پیٹ اور پیٹھ برابر ہوگئے ہیں۔ ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں۔ زبان خشک ہوگئی ہے۔ اور ناتوانی کے باعث دم کو اٹھانا بھی دوبھر ہوگیا ہے۔ جب بھوک زیادہ چمکتی ہے۔ تو پکار پکار کر کہتی ہیں۔ میاؤں (یعنی میں آؤں؟) کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ میاؤں۔ بھائی ہمارا سیاہ چمڑا دیکھ کر ہم سے نفرت نہ کرو۔ دنیا کی برکات پر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔ اس لئے

یا تو خود بخود کھانے کو دے دو۔ ورنہ مجبوراً چوری کریں گے۔ حیرت تو اس بات کی ہے۔ کہ ہمارا خشک چہرہ۔ خالی پیٹ اور سوال مجسم آنکھیں دیکھ کر بھی تمہارے دل میں ہمدردی کی لہر نہیں اٹھتی۔ چور کے لئے قانون ہے۔ تو کیا سنگ دل بخیلوں کے لئے قانون نہیں ہے؟ غریب آدمی زندہ رہنے کے لئے روٹی کھاتا ہے۔ تو یہ جرم ہے۔ لیکن امیر بخیل غریبوں کا خیال نہیں کرتا۔ تو یہ جرم نہیں ہے؟ کیا تم پر یہ امر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ چوروں کی چوری کا حقیقی باعث امیروں کا بخل ہے۔ تم حقہ کی نے منہ سے نکال کر مجھے جواب دو۔ کہ ایک امیر کو کیا حق ہے۔ کہ وہ پانسو غریبوں کو بھوکا رکھ کر آپ اس فخر سے گرم رہے۔ کہ میرے حساب کا بنک میں اتنے ہزار روپیہ جمع ہے۔ اگر اس کے پاس زائد روپیہ ہے تو غربا میں تقسیم کیوں نہیں کر دیتا۔ ورنہ بھوکے فاقہ مست ضرور چوری کریں گے۔ کیونکہ قدرت نے کسی کو بھوکا مرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔

بلّی کی یہ تقریر سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میں نے کہا "اے بلیوں میں پنڈتانی! تمہاری باتیں سخت بیہودہ اور سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کر دینے والی ہیں۔ اگر دنیا کے عیش و آرام پر اور برکتوں پر سبھی کا حق یکساں ہے۔ تو کسی کو کیا پڑی ہے۔ کہ محنت کرے۔ اور اگر امیروں کے لئے فرض ہے۔ کہ وہ اپنا روپیہ غربا میں تقسیم کر دیں۔ تو ان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے روپیہ کمائیں۔ کیوں نہ وہ بھی تمہاری طرح دوسروں سے حصہ طلب کرنے پر کمر کس لیں۔ بلّی! تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم قوم کو تباہ و برباد کر دو گی۔

بلی نے جواب دیا "یعنی ترقی نہ ہوگی۔ ٹھیک میرا یہی مطلب ہے۔ مگر اس سے ہم کو کیا غرض؟ اگر امرا کے پاس روپیہ نہیں رہتا۔ تو اس میں غربا کا کیا نقصان ہے؟"

میں نے غصہ سے جواب دیا۔ قومی دولت کی زیادتی کے بغیر قوم شاہراہ ترقی پر نہیں چل سکتی۔"

"مگر مجھے کھانے کو نہ ملے۔ تو میں تمہاری قومی ترقی کو کیا کروں؟"

بلی کو سمجھانا مشکل ہو گیا۔ جو غور و فکر کرنے والا ہوتا ہے۔ اور جس کا دماغ منطق کی دلائل ڈھونڈھتا ہے۔ اس کے کوئی بات ذہن نشین کرنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بلی معلوم ہوتا ہے۔ منطق کے اصول جانتی تھی۔ اس لئے وہ میرے قابو میں نہ آئی۔ تب میں نے مصلحت دیکھ کر کہا۔ ہو سکتا ہے کہ قومی ترقی سے غربا کو خاص فائدہ حاصل نہ ہو لیکن امرا کی اسی میں بہتری و بہبودی مضمر ہے۔ لہذا چور کو چوری کی سزا دینا عین انصاف ہے۔"

بی بی بلی نے پھر کہا "آپ چوروں کو پھانسی دید یجئے۔ ہمیں اعتراض نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور قاعدہ بھی وضع کیجئے۔ جو منصف چور کے مقدمہ کی سماعت کرے۔ پہلے اسے تین دن بھوکا رکھا جائے اس پر بھی اگر وہ کسی کی رسوائی سے چوری کرتا ہوا نہ پکڑا جائے۔ یا کسی حلوائی کی دکان پر جھپٹا مارنے کی خواہش اس کے دل میں نہ پیدا ہو۔ تو چور کو پھانسی دے دیا جائے۔ تم مجھے مارنے اٹھے تھے۔ لو تم ہی سے شروع کرتی ہوں۔ آج سے تین دن تک فاقہ کرو۔ اور اس کے بعد آکر تم سے پوچھوں گی۔ کہ کیوں بھوکی بلی کو روٹی کا ٹکڑا کھانے پر لکڑی سے پیٹنا

چاہیئے یا نہیں۔ یقیناً اس وقت تک تمہاری رائے بدل گئی ہو گی"۔
چالاک آدمیوں کا خیال ہے۔ کہ بحث میں ہار کر سنجیدگی سے کام لینا شروع کر دینا چاہیئے۔ میں نے بلّی سے کہا "دیکھو شریمتی! تمہاری باتیں نہایت لایعنی اور بے معنی ہیں۔ ان پر بحث کرنا بھی گناہ میں داخل ہے۔ تم ان دلائل کو ترک کر دو۔ اور دھرم کرم میں دل لگاؤ۔ اگر چاہو تو تمہارے لئے گیتا یا برہمانند کے بھجنوں کا گٹکا منگوا دوں۔ ان کے مطالعہ سے تمہیں اطمینان قلب نصیب ہو جائیگا۔ اور تمہیں پتہ لگ جائیگا۔ کہ تمہارا دھرم کیا ہے؟ لو اب تم جاؤ۔ صبح آنا۔ اپنی بچی ہوئی ربڑی تمہیں دے دونگا۔ لیکن رات کو کسی کی ہانڈی میں منہ نہ مارنا۔ اگر بھوک زیادہ معلوم ہو۔ تو میرے پاس آجانا۔ تھوڑی سی بھنگ دے دونگا۔ اس سے تمہاری بھوک کی آگ سرد پڑ جائے گی"۔

بلّی نے جواب دیا "بھنگ کی مجھے ضرورت نہیں۔ باقی رہا کسی کی ہانڈی میں منہ مارنے کا سوال۔ اس کا تصفیہ بھوک لگنے ہی پر ہو سکتا ہے"۔

بلّی چلی گئی۔ اس وقت یہ سوچ کر میرا دل مسرت سے ناچنے لگا۔ کہ میں نے ایک گمراہ روح کو صداقت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ اور تاریکی سے نکال کر روشنی کی سرزمین میں پہنچا دیا ہے۔

برخوردار

(۱)

پڑھو۔ برخوردار **मातृवत् परदारेषु ।**

بیٹا۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

باپ۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ جتنی غیر عورتیں ہیں۔ ان تمام کو اپنی والدہ سمجھنا چاہیئے۔

بیٹا۔ تو تمام عورتیں میری والدہ ہیں؟

باپ۔ ہاں برخوردار! سب عورتیں تیری والدہ ہیں۔

بیٹا۔ تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔

باپ۔ کیوں بیٹا؟

بیٹا۔ جب وہ میری والدہ ہوئیں۔ تو آپکی کیا ہوئیں؟

باپ۔ چل گدھے! ایسی بات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ آگے پڑھ

मातृवत् परदारेषु परद्रव्येषु लोष्टवत् ।

بیٹا۔ کیا مطلب؟

باپ۔ پرائی چیز کو لوشٹ سمجھنا چاہیئے۔

بیٹا۔ لوشٹ کیا؟

باپ۔ مٹی کا ڈھیلا۔

بیٹا۔ تب تو حلوائی کے پیڑے کی قیمت کچھ نہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ مٹی کے ڈھیلوں

کی بھی کوئی قیمت دیتا ہے؟

باپ۔ یہ مطلب نہیں۔ پرائی شے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ جس طرح تم مٹی کے ڈھیلے کی طرف نہیں دیکھتے۔

بیٹا۔ کمہار کا پیشہ سیکھنے سے کیا کام نہ چل سکیگا؟

باپ۔ تو نرا گدھا ہی رہے گا۔

بیٹا۔ آگے پڑھائیے۔

باپ　　आत्मवत् सर्वं भूतेषु यः पश्यति स पण्डितः ।

بیٹا۔ आत्म वत् सर्व भूतेषु　　کیا بابوجی۔

باپ۔ اپنے جیسا سب کو سمجھو۔

بیٹا۔ تب تو کام بن گیا۔

باپ۔ وہ کس طرح۔

بیٹا۔ جب دوسرے اپنے جیسے ہیں۔ تو دوسروں کی چیزیں بھی ہماری ہیں۔ اور دوسروں کی عورتیں بھی ہماری عورتیں ہیں۔

باپ۔ بدمعاش پاجی! بات بات میں شرارت کرتا ہے۔

(دو تین تھپڑ)

(۲)

رام رکھی نامی ادھیڑ عورت گھڑا لئے پانی بھرنے جارہی تھی۔ کہ وہی برخوردار باپ سے کتاب پڑھنے کے بعد سامنے آکھڑا ہوا۔ اور بولا "ماں" رام رکھی۔ کیوں بیٹا! (دل میں) کیا شیریں زبان بچہ ہے۔ بات سن کر جی خوش ہوگیا" لڑکا۔ مٹھائی کے لئے ایک پیسہ تو دو۔

رام رکھی۔ میں آپ غریب ہوں۔ پیسہ کہاں سے لاؤں ؟

لڑکا۔ اوں ہوں ؟

رام رکھی۔ بیٹا میرے پاس پیسہ نہیں ہے ؟

لڑکا۔ چڑیل ؟

رام رکھی۔ مر کمبخت! تیری زبان کو آگ لگے۔ سویرے سویرے کہاں سے آگیا؟

لڑکا۔ تو پیسہ نہیں دے گی؟

رام رکھی۔ نہیں دوں گی۔ تو ہے کون بھوت ؟

لڑکا۔ اچھا تو لے ؟

یہ کہہ کر بندر کے مانند اس کے گلے لپٹ گیا۔ رام رکھی بچنے کی خاطر بھاگی گھڑا ٹوٹ گیا۔ اتنے میں لڑکے کا باپ آگیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا:۔

باپ۔ یہ کیا یاجی ؟

بیٹا۔ آپ ہی نے تو سکھایا ہے۔ کہ سب عورتیں میری ماں کی طرح ہیں۔ اس لئے میں نے اسے جس طرح ماں کو کہا کرتا ہوں۔ کہا کہ مٹھائی کیلئے پیسہ دے۔ مگر اس نے کہا۔ نہیں ہے۔ میں جس طرح ماں کو گالی دیا کرتا ہوں۔ اسی طرح اس کو دی۔ مگر اس نے مجھے دو تین سنا دیں۔ اس پر میں نے بالکل اسی طرح جس طرح اپنی ماں کو مارا کرتا ہوں اسے مارا ہے۔ پوچھ کر دیکھ لو ؟

باپ۔ جی چاہتا ہے۔ مار مار کر تیری ہڈیاں توڑ دوں ؟

بیٹا۔ اور دیکھئے یہ میری ماں کی طرح آپ کے سامنے گھونگٹ نہیں نکالتی ؟

لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد حلوائی فریاد لے کر آیا کہ آپ کے لڑکے نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔ جو چیز دیکھتا ہے اٹھا

لیتا ہے۔ گوالے نے بھی کہا۔ لڑکے کو منع کیجئے۔ میرا نقصان کر آیا ہے ؛

(۳)

اب باپ سے ضبط نہ ہو سکا اس نے لڑکے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکا روتے روتے بولا۔ مارتے کیوں ہو؟

باپ۔ تو حلوائی کے پیڑے کیوں اٹھا لایا ہے؟

بیٹا۔ آج کل چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں مٹی کے ڈھیلے جمع کر رہا ہوں

باپ۔ مٹی کے ڈھیلے کیسے؟

بیٹا۔ وہ مٹی کے ڈھیلے ہی تو ہیں ؛

باپ۔ تو بکتا کیا ہے؟

بیٹا۔ آپ ہی پڑھاتے ہیں۔ آپ ہی بھول جاتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں پڑھایا تھا:-　**परद्रव्येषु लोष्ठवत्।**

پرائی چیزیں مٹی کے ڈھیلوں کے مانند ہیں ؛

باپ ہنسی کو نہ روک سکا۔ لائق برخوردار آنسو پونچھ کر ماں کے پاس اندر چلا گیا ؛

(۴)

بساکھی کا دن تھا۔ باپ نے کہا۔ جا جا کر ادی پر نہا آ۔ ورنہ روٹی نہیں ملیگی ؛

بیٹا۔ کھا کر نہا آؤں گا ؛

باپ۔ بے وقوف کھانے سے پہلے نہایا کرتے ہیں۔ کوئی کھانے کے بعد بھی نہاتا ہے ؛

بیٹا۔ تو اگلے سال سہی۔ اس وقت جی نہیں چاہتا ؛

باپ۔ اچھا تو روٹی بھی اگلے سال سہی۔ اس وقت آٹا مہنگا ہو رہا ہے۔

ذرا کفایت ہو جائے گی ٭

بیٹا۔ مگر مجھے تو بھوک لگ رہی ہے ٭

باپ۔ تو جاؤ (پیار سے پچکار کر) جا کر جھٹ پٹ نہا آؤ۔ اندر سے ملیں گے ٭

لڑکا اچھلتا کودتا ہوا روانہ ہوا۔ لیکن باپ کی نصیحت کان میں گونج رہی تھی۔ اس نے جاتے ہی ایک لڑکے کو پانی میں گرا کر دو تین غوطے دے دیئے۔ اور اسے ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ باپ نے پوچھا۔ نہا آیا ٭

لڑکا۔ جی ٭

باپ۔ (چہرہ دیکھ کر) میاں تو تیرے منہ پر ویسی ہی جمی ہوئی ہے ٭

لڑکا۔ میں نے اسے نہلا دیا ہے۔ بات ایک ہی ہے ٭

आत्मवत् सर्व भूतेषु यः पश्यति स पण्डितः ।

سب کو اپنا آپ سمجھو۔ اس لئے اسے نہلانے سے گویا میں نے نہا لیا۔ اب لائیے اندر سے ٭

باپ چھڑی لے کر بیٹے کے پیچھے بھاگا۔ مگر وہ نکل گیا۔ اس کے بعد لائق برخوردار کے باپ نے سنا۔ کہ وہ پاٹھ شالا کے ایک لڑکے کو مار کر بھاگ گیا ہے۔ گھر آتے ہی اس نے پوچھا " تو نے کیا کیا ہے ؟"

بیٹا۔ کچھ بھی نہیں۔ آپ نے مارنا تھا۔ میں خود مار کھا آیا ہوں۔ اب اور کیا کہتے ہیں آپ ٭

باپ۔ تو آپ مار کھا آیا ہے۔ یا دوسرے کو مار آیا ہے ٭

بیٹا۔ ایک ہی بات ہے۔ میں دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتا ہوں ٭

باپ نے قسم کھائی۔ کہ اب اس لڑکے کو نہ پڑھاؤں گا۔ لڑکے کو چھٹی ملی ٭

بندر اور بابو

ایک دن صبح کے آفتاب کی چمکتی ہوئی کرنوں سے منوّر باغ میں ایک بندر صاحب ہوا کھا رہے تھے۔ ان کی خوبصورت دُم۔ کبھی پیٹھ کی، کبھی کندھے کی اور کبھی درختوں کی شاخوں کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھی۔ چاروں طرف کیلوں کی سہانی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بندر صاحب کبھی سونگھ کر۔ کبھی چھُو کر۔ کبھی چبا کر۔ کبھی چوس کر اور کبھی چاٹ کر خوشنودیٔ طبع کا اظہار کر رہے تھے۔ اتنے میں حُسنِ اتفاق سے سوٹ بوٹ پتلون چین چشمہ پہنے چھڑی لئے ایک بابو صاحب آتے دکھائی دیئے۔ بندر نے اسے دور سے دیکھ کر سوچا۔ یہ کون ہے۔ رنگ روپ سے تو کسی کلندھا واسی میرا ہی بھائی نظر آتا ہے مگر کچھ بکچھ فرق ہے۔ تاہم یہ میرا سودیشی بھائی ہے۔ اس کی کچھ تو اضع کرنا چاہیئے۔

یہ سوچ کر بندر مہاراج نے چمپا کیلے کی پکی ہوئی پھلیاں توڑ کر سونگھیں۔ ان کی مہک سے مطمئن ہو کر مہمان کی خاطر کرنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں اس کوٹ پتلون پہننے والے بابو نے اس کے سامنے آکر پوچھا:۔

Mr. Hanuman ! How do you do. So glad to see you. Ah, I see, you are at breakfast already.

بندر صاحب سلام امزاج شریف۔ آپ سے ملکر طبیعت خوش ہو گئی۔ خوب! آپ حاضری پر بیٹھ گئے۔

بندر نے کہا۔ کیا کہتے ہو۔ کیا بات ہے؟

بابو۔ سمجھ نہ سکے۔ کہ اب کیا کروں۔ ان کی زبان پر انگریزی چڑھی ہوئی تھی۔ اُردو ہندی بولتے وقت ہونٹ کانپتے تھے۔ آخر بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا:۔

Whats that ! I suppose, that is the kishkandha potois. It is a glorious country. Is it not. There is a land of every land, the pride, and so on as you know.

بندر۔ کون ہے تو۔ کہاں سے آیا ہے؟

بابو۔ (اپنے آپ سے)

It seems most barbarous, gibberish that precious lingo of his, but I suppose I must put up with it.

یہ سوچ کر وہ پھر آگے بڑھے۔ لیکن عادت طبیعت ثانی ہو چکی تھی۔ پھر بھی منہ سے انگریزی ہی نکلی۔ بابو صاحب چاہتے تھے۔ کہ اپنی زبان میں بات چیت کریں۔ مگر نہ کر سکے۔ مُنہ سے انگریزی فرفر نکلی:۔

My dear Hanuman! I am ashamed to confess, that I am not quite familiar with your beautiful vernakular. I dare say, it is a very polished language. I presume you can talk a little English.

ہنومان حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ منہ سے کچھ اوٹ پٹانگ نکل گیا ہے۔ مگر دوسری دفعہ ٹھیک بولے گا۔ مگر دوسری دفعہ بھی جب دیکھا کہ وہ وہی راگ الاپ رہے ہیں۔ تو یہ سنتے ہی بندر صاحب نے آنکھیں سُرخ کر اپنی دم سے بابو صاحب کے گلے کو قابو کر لیا۔ بابو صاحب ہکّے بکّے رہ گئے۔ منہ سے چرٹ گر پڑا۔ وہ بولے:۔

I say this seems some what—

بندر نے دم اور کس لی۔ بابو بولے:۔

what, somewhat unmannerly—to say the least.——

Dear Mr Hanuman! you will hurt me.

پھر کسا

Kind good Mr. Hanuman!

اتنے میں مہابیر نے بابو کو دم سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ بابو کی ٹوپی چشمہ اور چابک نیچے گر پڑی۔ گھڑی پاکٹ سے نکل کر ہوا میں جھولنے لگی۔

بابو کا منہ خشک ہو گیا۔ وہ چلانے لگے۔ مہا بیر جی! معاف کرو غلطی ہو گئی۔ مر جاؤں گا۔

مہا بیر نے مہربانی کر کے اسے زمین پر رکھ دیا۔ اور دم کی لپیٹ کھول دی۔ بابو نے موقع پاکر چشمہ چابک کو اٹھا لیا۔ بندر بولا۔ بابو صاحب! برا نہ ماننا۔ تمہاری زبان انگریزی۔ لباس بندروں کا سا۔ اور بیوقوفی پہاڑ کی سی ہے۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا۔ کہ آپ کون ہیں۔ آپ کی قومیت جاننے کیلئے آپ کو اتنی تکلیف دی۔ اب معلوم ہو گیا۔

بابو۔ کیا معلوم ہو گیا؟

بندر۔ یہی کہ آپ ہندوستانی ہیں۔ آپ تھک گئے ہونگے۔ کیلا کھائیے گا؟

بابو صاحب کا چہرہ خشک ہو گیا تھا۔ پکا مٹا کیلا دیکھ کر رضا مند ہو گئے۔ بولے۔

With the greatest pleasure.

بندر۔ آپ کی جس مقام پر پیدائش ہوئی ہے۔ وہاں کیلے اور بینگن کی تلاش میں اکثر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کی مستورات بڑا نام کی جو لذیذ شے بناتی ہیں۔ وہ بھی بغیر اجازت کے ہی رام داس کو بھوگ لگایا کرتا ہوں۔ اس لئے میں دیسی زبان بخوبی سمجھتا ہوں۔ تم اسی زبان میں مجھ سے گفتگو کرو:۔

بابو۔ ٹھیک ہے۔ آپ کیلا دینا مانگتا ہے۔ میں بڑی خوشی سے آپ کا کیلا کھا جاؤں گا۔

یہ سن کر ہنومان نے کیلے کی کئی پھلیاں بابو کی طرف پھینک دیں۔ بابو صاحب نے نہایت رغبت سے کھانا شروع کیا۔ بندر نے پوچھا کیسے ہیں؟

بابو Delicious.

بندر۔ اپنی زبان میں بولو ٭

بابو۔ غلطی ہو گئی۔ Excuse me

بندر۔ یہ کیا کہا آپ نے؟

بابو۔ معاف کیجئے۔ میں بڑا کیا کہوں۔ انگریزی میں Greatful.—
کہتے ہیں۔ دیسی زبان میں پتہ نہیں اِسے کیا کہتے ہیں ٭

بندر۔ بچہ! میں تمہاری باتوں سے بڑا خوش ہوا ہوں۔ تم اور بھی کیلے کھا سکتے ہو۔ جتنی خواہش ہو۔ کہو۔ میرے لائق کوئی کام ہو۔ تو وہ بھی بتا دو کر دوں گا ٭

بابو۔ شکر گذار ہوں۔ ہنومان جی! آپ ایک بات مجھے بتا دیں۔ تو بڑا احسان ہو گا ٭

بندر۔ پوچھو ٭

بابو۔ وہی بات جس کے لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ نے رام راج دیکھا ہے۔ کیا ویسا راج اور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا؟ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ کہ یہ سب غلط باتیں ہیں ٭

بندر۔ (سُرخ آنکھیں نکال کر) کیا کہتے ہو۔ رام راج فرضی کہانی ہے؟ وہ کبھی نہیں ہوا؟ تب تو میں بھی فرضی ہستی ہوں۔ میری دم بھی فرضی ہستی ہے؟ دکھاؤں تجھے ٭

اتنا کہہ کر بندر نے غصّہ کے مارے اپنی لمبی دم بابو کے گلے کے گرد لپیٹ دی۔ بابو کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ بولا۔ ٹھہریئے جناب! نہ تم فرضی ہو۔ تمہاری دم فرضی ہے۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں۔ لہٰذا تمہارا رام راج بھی فرضی نا ول

نہیں ہو سکتا۔

The proof of the Pudding is in the eating thereof.

بات یہ ہے۔ کہ تم رام چندر جی کے سیوک ہو۔ اور میں انگریزوں کا۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ تمہارے رام بڑے یا میرے انگریز بڑے ہیں۔ اس عہد حکومت میں ایک نئی چیز کا ظہور ہوا ہے۔ کیا وہ تمہارے رام راج میں بھی تھی؟

بندر۔ وہ چیز کیا ہے؟ پکا ہوا کیلا!

بابو۔ نہیں **Local self Government.**

بندر۔ یہ کیا بلا ہے؟

بابو۔ حکومت خود اختیاری؟

بندر۔ ہاں یہ تھی۔ اور ہندوستان میں ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ مثلاً میری حکومت تھی اپنی دُم پر۔ اگر نہ ہوتی۔ تو ترتیا یُگ۔ میں نصف سے زیادہ آبادی سمندر میں غرق ہو جاتی جب کبھی میری دم میں کھجلی ہوتی تھی۔ اور اسے کسی کی گردن کے گرد لپٹنے کو طبیعت بے قرار ہوتی تھی۔ تو میں دم پر حکومت کر کے اُسے ٹانگوں میں دبا لیتا تھا۔ یہاں تک کہ جس وقت شری سیتا جی کو مہاراج رام چندر نے اگنی میں کودنے کو کہا تھا۔ اس دن اگر میری حکومت خود اختیاری نہ ہوتی۔ تو یہ دُم مہاراج رام چندر کے گلے میں پہنچتی۔ لیکن حکومت خود اختیاری کے باعث میں دم دبا کر رہ گیا۔ ایک بات اور جب ہم لنکا گھیرے بیٹھے تھے۔ اس وقت ہماری حکومت پیٹ پر چلتی تھی۔ ورنہ لنکا کی شہری

سازشوں میں قابو آجاتے۔

بابو۔ آپ نہیں سمجھتے۔ میرا مطلب اس حکومت خود اختیاری سے نہ تھا۔

بندر۔ سنو تو سہی۔ حکومت خود اختیاری درحقیقت بڑی عمدہ شے ہے۔ مستورات کی حکومت خود اختیاری زبان پر ہو تو اچھی ہے۔ براہمنوں کی حکومت خود اختیاری لڈو پیڑے پر ہو۔ تو اچھی ہے۔ تمہاری حکومت خود اختیاری ....

بابو۔ کیا پیٹھ پر؟

بندر۔ نہیں تمہاری پیٹھ پر تو دوسروں کی حکومت ہے۔ تمہاری حکومت خود اختیاری آنکھوں پر ہے۔

بابو۔ وہ کیسے؟

بندر۔ تمہیں رونا آتا ہے۔ مگر نہیں روتے۔ یہی تمہاری حکومت خود اختیاری ہے۔ دن رات رونے چلانے سے حضور لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔

بابو۔ خیر میرا مطلب اس حکومت خود اختیاری سے نہ تھا۔

بندر۔ تو کس سے تھا؟

بابو۔ حکومت کسے کہتے ہیں؟ جانتے ہو۔

بندر۔ ہاں جانتا ہوں۔

بابو۔ بتاؤ۔

بندر۔ فرض کیا میں تمہارے گال پر تھپیڑ ماروں۔

بابو۔ تو ....

بندر۔ میں نے تم پر حکومت کی۔ اسی کا نام حکومت ہے نا۔

بابو۔ نہیں گورنمنٹ کی حکومت کیا تم نہیں جانتے۔

بندر۔ مگر بھیا۔ وہ تو جب تک تم خود راجہ نہ ہو۔ تب تک ناممکن ہے ٭
بابو۔ (دل میں) بندر کی عقل ہے۔ اس بات کو کیا سمجھ سکتی ہے (ظاہر میں) اور اگر بادشاہ اپنا کام ہمیں بخشش کر دے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بندر۔ اس میں بھی اسی کا فائدہ ہے۔ اپنا کام تمہارے حوالے کر دیا۔ اب وہ آرام کرے گا۔ اور تم محنت کر کے مرو گے۔ کیا اسی کو تم رام راج کہتے تھے ؟
بابو۔ آپ نے میرا مطلب ابھی تک نہیں سمجھا ٭
Liberty. کسے کہتے ہیں۔ جانتے ہو ٭
بندر۔ کشکندھا کے پاٹھ شالا میں یہ نہیں پڑھایا جاتا تھا ٭
بابو۔ سنو مہاراج **Freedom.** کہتے ہیں۔ آزادی کو۔ آزادی کسے کہتے ہیں یہ تو جانتے ہو نہ ٭
بندر۔ آزادی کو میں جنگلی جانور نہیں جانتا۔ تو کیا تم جانتے ہو ٭
بابو۔ بس یہی میرا مطلب ہے ٭
بندر۔ کہو ٭
بابو۔ آدمی کو جتنی آزادی ملے گی۔ اسی قدر زیادہ آسایش نصیب ہونگی ٭
بندر۔ گویا انسانوں پر جس قدر زیادہ حیوانیت کا اثر ہو گا اسی قدر زیادہ اسے آسائشیں نصیب ہوں گی ٭
بابو۔ برا نہ مانیے گا۔ یہ بات آپ نے ٹھیک بندروں جیسی کہی ہے ٭
بندر۔ بندر بندر جیسی بات نہ کہے گا۔ تو کیا بابوؤں کی سی کہے گا۔ تم مطلب کی بات کرو ٭
بابو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ آزادی کے بغیر انسانیت حیوانیت ہے۔ غلام لوگ

بیل گوؤں کی مانند بندھے ہوئے مار کھاتے رہتے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے۔ کہ ہمارے مالک پیدائش ہی سے آزاد ہیں ؂

بندر۔ ہماری طرح؟

بابو۔ اس آزادی کا مقصود حکومت خود اختیاری ہے ؂

بندر۔ ہمارا بھی تو وہی مقصود ہے۔ ہم میں حکومت خود اختیاری ہے۔ گورنمنٹ نہیں ہے۔ ہم دنیا میں بالکل آزاد ہیں۔ کیا تم ہماری طرح آزاد ہو سکتے ہو؟

بابو۔ اچھا جانے دو۔ میں سمجھ گیا۔ تم حکومت خود اختیاری کے مطالب سے قطعاً ناآشنا ہو ؂

بندر۔ تو جانے ہی دو۔ بہت باتیں کر کر کے تھک گئے ہو گے۔ آؤ کیلے کھائیں کھاؤ گے؟

بابو۔ بڑی مہربانی۔ بڑی مہربانی ؂

رام کٹیا بک ڈپو سیریز

اِس سلسلہ میں نہایت دلچسپ مفید اور عالمانہ کتابیں شایع کیجا رہی ہیں۔ جو صاحب آٹھ آنے چندہ بھیجکر مستقل خریدار بنجائینگے۔ اُن کو اس سلسلہ کی ہر ایک کتاب ¾ قیمت پر دیجائیگی۔ اب تک مفصلہ ذیل کتب شایع ہو چکی ہیں :-

۱- ڈرامارشی دیانند۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت .. .. .. ۱۰؍

۲- رتن ساگر۔ لالہ دیوان چند ایم کے مضامین۔ ختم ہے۔

۳- چٹکیاں۔ فطرت نگار سدرشن کی مذاقیہ تصنیف دوسرا ایڈیشن - ۴؍

۴- سدا بہار پھول۔ نہایت دلکش کہانیاں تیسرا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے ۱۲؍

۵- بیگناہ مجرم۔ جناب سدرشن کا تصنیف کردہ ایک دلکش ناول۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت .. .. عہ؍

۶- دیانند ناٹک۔ ہندی میں۔ قیمت .. .. ۱۲؍

۷- تہذیب کے تازیانے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت .. .. .. ۱۲؍

۸- صبح وطن۔ جناب سدرشن کی قومی کہانیاں۔ دوسرا ایڈیشن۔ عہ؍ سنہری جلد۔ قیمت .. .. عہ

۹- آنریری مجسٹریٹ۔ نہایت ہی دلکش ناٹک ۴ہ

۱۰- چندن۔ ملک کے بہترین قصہ نویس جناب سدرشن کی پندرہ کہانیاں عہ۔ سنہری ریشمی جلد .. .. عا

۱۱- قوم پرست۔ تاریخ راجستھان کا ایک حیرت زا واقعہ۔ قیمت عہ؍

ملنے کا پتہ :- **منیجر رام کٹیا بک ڈپو لاہور**